اُردو زبان

تشکیل و ارتقا

ڈاکٹر عبد الستار ملک

اردو زبان: تشکیل و ارتقا

ڈاکٹر عبدالستار ملک

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

ISBN:...............

نام کتاب .... اردو زبان: تشکیل وارتقا

مصنف .... ڈاکٹر عبدالستار ملک

اشاعت 2021ء

تعداد اشاعت 500

قیمت .... 500 روپے

ناشر .... کریئیٹو پبلشرز، فیصل آباد

Creative

Publishers

2nd floor, Subhan Plaza, Press Market,

Aminpur Bazar, Faisalabad. +92 300 72 88 544

Email. hzhafeez@gmail.com

فہرست مندرجات

صفحہ

پیش لفظ 5

باب اول

اردو زبان اور اس کا لسانی مزاج 7

باب دوم

اردو کی تشکیل میں مشرقی زبانوں کا کردار اور مستقبل کا منظر 37

باب سوم

اردو زبان کے عہد بہ عہد مختلف ناموں کا جائزہ 59

(ہندوی، گجری، دکنی، ریختہ، اردو)

باب چہارم

اردو زبان کی تشکیل کے نظریات 83

باب پنجم

اُردو اور پاکستانی زبانوں کا ربطِ باہم 107

باب ششم

اُردو قومی اور عالمی تناظر میں 127

پیش لفظ

بی ایس اردو (چار سالہ) پروگرام کا یہ بنیادی کورس ہے۔اُردو نہ صرف پاکستان کی قومی زبان ہے، بلکہ جنوبی ایشیا کی اہم ترین زبان بھی ہے۔اپنے منفرد مزاج کے سبب یہ دنیا کی مقبول ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔اس بنا پر اس کی اہمیت دو چند ہے۔اردو زبان کے طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اردو زبان کے پس منظر، پیش منظر اور دورِ حاضر میں اس کے کردار اور اس کی مختلف اور متنوع جہات سے کما حقہٗ آگاہ ہو۔یہ کتاب اسی ضرورت کے تحت تحریر کی گئی ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان کا جامع تعارف سامنے آجائے۔اس کتاب کا مقصد اُردو زبان کے تعارف، لسانی مزاج، آغاز و ارتقا، قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں اس کے تہذیبی، علمی، سیاسی اور سماجی کردار؛ ملکی اور غیر ملکی سطح پر اس کی حیثیت، مقام اور مرتبے سے روشناس کرانا ہے۔ ہر باب کے آغاز میں مندرجات کی فہرست اور متن مین ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں تاکہ تفہیم میں آسانی ہو۔اُمید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد طلبہ اردو زبان کی مختلف جہات سے آشنا ہو جائیں گے۔ چند ضروری موضوعات کا اگلے ایڈیشن میں ایزاد کیا جائے گا۔مثبت تنقید اور آرا خوش دلی سے قبول کی جائیں گی۔

ڈاکٹر عبدالستار ملک

باب اول

اردو زبان اور اس کا لسانی مزاج

فہرست مندرجات

الف۔اردو زبان کا تعارف

ب۔زبانوں کے خاندان

ج۔اردو کا امتیازی مزاج۔متنوع لسانی پس منظر کے آئینے میں

اردو زبان اور اس کا لسانی مزاج

الف ۔ اردو زبان کا تعارف

زبان سے مراد ایک عضوِ تکلم بھی ہے اور بولی بھی۔ انسان کے منہ میں بتیس دانتوں کے درمیان گوشت کے ٹکڑے کو جو بولنے کا آلہ ہے، عربی میں لسان، فارسی اور اُردو میں زبان، انگریزی میں Tongue ہندی اور پنجابی میں جیبھ کہتے ہیں، لیکن یہاں ہماری مراد محض پارۂ گوشت سے نہیں، بلکہ لسانی زاویۂ نگاہ سے زبان سے مراد وہ الفاظ و کلمات ہیں، جو کوئی فرد اپنے منہ سے ادا کرتا ہے۔

ماہرینِ لسانیات اور لغت نگاروں نے زبان کی مختلف تعریفیں کی ہیں:

نور اللغّات کے مطابق:

'' جیبھ؛ بول چال؛، روزمرہ؛ وہ بولی، جس کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات ظاہر کر سکے''۔(۱)

فرہنگِ تلفظ:

''زبان؛ منہ کے اندر ذائقہ چکھنے اور بولنے میں حرکت کرنے والا عضو؛ جیبھ؛ بولی؛ لسان (محاورہ)؛ قول؛ اقرار؛ کسی طبقے کا مخصوص محاورہ''۔(۲)

اُردو لغت (تاریخی اصول پر):

''زبان؛ منہ کے اندر وہ عضوِ خاص، جس میں قوتِ ذائقہ ہوتی ہے اور جو نطق کا ذریعہ ہے؛ جیبھ؛ بولی، جس کے ذریعے انسان تکلم یا تحریر کی صورت میں اپنے خیالات اور جذبات ظاہر کرتا ہے؛ بول چال؛ روزمرہ

؛بات؛قول''۔(۳)

اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ میں:

''انسانوں میں تبادلۂ خیال کا منظّم صوتی ذریعہ''۔(۴)

ڈاکٹر محی الدین قادری کے مطابق:

''زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے، جس میں زیادہ تر قوّتِ گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے، اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے''۔(۵)

ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کے نزدیک:

''لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں، جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے''۔(٦)

مندرجہ بالا تعریفوں پر اگر غور کریں تو ہر ایک نے اپنے نقطۂ نظر سے زبان کی ماہیت کو بیان کیا ہے۔کم وبیش ہر تعریف کسی مخصوص خاصیت کو اہمیت دیتی ہے اور دوسری خصوصیات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔زبان میں جہاں نطقی آوازوں کا ایک نظام کے مطابق ہونا ضروری ہے، وہاں جسمانی اشاروں کی بھی یکساں اہمیت ہے۔اس کے ساتھ جب زبان تحریری روپ اختیار کرتی ہے تو اس کے لیے کچھ مخصوص علامات متعین کرنا پڑتی ہیں۔اگر ہم ان تینوں نکات کو ذہن میں رکھیں تو زبان کی تعریف یوں کر سکتے ہیں:زبان بامعنی آوازوں، جسمانی اشاروں اور صوتی علامتوں کا ایسا نظام ہے، جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے۔

انسان فطرتاً معاشرت پسند ہے۔ یہ دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ رہ کر نہ تو زندگی گزار سکتا ہے اور نہ ہی خیالات و جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ انسانی اظہار و ابلاغ کا مؤثر ترین ذریعہ زبان ہے۔ انسان کی یہی خاصیت، اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان حیوانِ ناطق ہے اور زبان کے ذریعے اپنے تصورات، احساسات اور جذبات کے اظہار پر قادر ہے۔ خالقِ کائنات نے علم اور بیان کے شرف سے نواز کر انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ سورۂ رحمٰن میں تخلیقِ انسان کے بعد، جس بڑی نعمتِ خداوندی کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نطق و بیان کی قوت ہے۔

خلق الانسان o علمه البیان o (۷)

ترجمہ: انسان کو پیدا کیا اور اس کو قوتِ گویائی سکھائی۔

زبان پر انسانی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا دارومدار ہے۔ دنیا کی ساری تہذیبی ترقی زبان کی رہینِ منت ہے۔ اس کے بغیر ہم مجبورِ محض ہیں، نہ خود اظہارِ جذبات کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کے افکار و خیالات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ زبان ہی بنی نوعِ انسان کی سب سے قیمتی تہذیبی میراث ہے اور ہمارے فکری، ذہنی، اخلاقی اور روحانی سرچشموں کی محافظ بھی۔

عربی میں مقولہ ہے: الانسان باللسان o انسان زبان کی وجہ سے ہے۔ بلاشبہ زبان قدرت کی ایک بڑی نعمت اور انمول تحفہ ہے، جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے، کم ہے۔ زبان شعورِ انسانی کو مہمیز کرتی ہے۔ زبان سے فکر میں استحکام، سوچ میں ربط اور خیالات میں تنظیم پیدا ہوتی ہے، جس سے تفکر، تعقل اور وجدان کی قوتیں نشو ونما پاتی ہیں اور انسانی ذہن کا ارتقا ممکن ہوتا ہے۔ فکر کی ترسیل کا واحد ذریعہ بھی زبان ہی ہے۔ زبان کے ذریعے ہم اپنے

افکار وخیالات اپنی معاصر اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہیں۔غرض انسان کی شخصیت کی تعمیر اور تہذیبِ انسانی کی تشکیل وارتقا میں زبان کا کردار محتاجِ بیاں نہیں۔زبان اور انسان کا رشتہ اس قدر ناگزیر ہے کہ زبان کے بغیر انسان کا تصور بھی محال ہے۔زبان وہ لازمۂ حیات ہے، جس سے انسانی ذہن اور کردار کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے اور تخلیق واظہار کے سر چشمے پھوٹتے ہیں۔زبان تمدنِ انسانی کی روحِ رواں اور سماجی ترقی کی معراج ہے۔یہ آلۂ فکر بھی ہے اور ذریعۂ اظہار بھی۔یہ ذہنِ انسانی کے تمام اعلیٰ ترین کمالات اور ارتقائے حیات کے تمام مظاہر کی عکاس اور نقیب ہے۔زبان کی تعلیم کے بغیر علمی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ب۔زبانوں کے خاندان

ماہرینِ لسانیات نے بعض اساسی اور مشترکہ خصوصیات کی بنا پر زبانوں کی درجہ بندی کی ہے۔اس درجہ بندی میں زبان کی ساخت اور تشکیل کے ساتھ جغرافیائی اور تہذیبی ونسلی محرکات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔تاریخی اور نسلی محرکات کے لحاظ سے دنیا کی زبانوں کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

ا۔سامی: اس میں عبرانی، فنقی، عاشوری اور قدیم شام اور بابل کی، وہ زبانیں شامل ہیں، جواب ناپید ہو چکی ہیں۔موجودہ دور میں عربی اور افریقہ میں چند حبشی زبانیں اس کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۲۔ہند چینی: اس میں چینی سیامی (اس سلسلے میں سات زبانیں) تبّتی (ہمالوی اور اسی سلسلے کی تئیس زبانیں) اور برمی مع چھبیس شاخوں کے شامل ہیں۔

۳۔دراوڑی: تامل، تلگو، ملیالم، کنڑی ہندوستان میں، پاکستان میں براہوی۔

۴۔مونڈرا:اس میں ہندوستان کی گونڈ،نستھال،منڈلی،راج محل اور سنبھل پوری۔

۵۔بانتو:افریقہ کی ایک سو پچاس زبانیں۔

۶۔امریکی ریڈانڈین قبائل: متعدد ریڈانڈین قبائل کی زبانیں۔ان میں سے بعض اب ان قبائل کے ساتھ ہی ناپید ہو چکی ہیں۔

۷۔ملایا:اس علاقے کی متعدد زبانیں۔

۸۔ ہند یورپی: زبانوں کے اس عظیم سلسلے کو آریائی اور ہند جرمانی بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان کی بیشتر بڑی زبانوں کے علاوہ یورپ کی تمام اہم زبانیں، جیسے:انگریزی، جرمن،فرانسیسی،اطالوی اور کیلٹک زبانیں''۔(۸)

مندرجہ بالا خاندانوں میں ہند یورپی خاندان سب سے اہم ہے، کیونکہ اس میں اکثر ایسی زبانیں شامل ہیں، جو علمی وادبی لحاظ سے دنیا کی رہنما زبانیں ہیں۔ ہند یورپی خاندان کی زندہ زبانوں کو آٹھ شاخوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔

''ا۔ ہندایرانی یا آریائی

۲۔ ارمنی

۳۔ بلقان سلافی

۴۔ البانوی

۵۔ ہیلینی

۶۔ اٹالوی

۷۔ کیٹلک

۸۔ ٹیوٹونی''۔(۹)

''ہندایرانی رآریائی خاندان کومزید تین شاخوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

۱۔ ایرانی

۲۔ پشاچہ

۳۔ ہندآریائی''۔(۱۰)

ہماری زبان اُردو کا تعلق ہندآریائی شاخ سے ہے۔

ج۔اردو کا امتزاجی مزاج۔متنوع لسانی پس منظر کے آئینے میں

اردو زبان اپنے مزاج اور منہاج کے اعتبار سے امتزاجی اور آویزش وآمیزش کے رجحان کی آئینہ دار ہے۔اردو کی بنیاد ہی امتزاج واشتراک پر اُستوار ہوئی۔ایک طرف اگر اس نے سنسکرت، کھڑی بولی، برج بھاشا اور مقامی بولیوں سے استفادہ کیا تو دوسری طرف عربی، فارسی اور ترکی اس کی رہبر ورہنما ثابت ہوئیں۔ان تمام زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ اور سرمایۂ ادب انتخاب واختیار کے مراحل طے کر کے اردو کا جزوِترکیبی بنا اور اس کے قوام میں شامل ہوگیا۔اس طرح اردو کی یہ وحدت، کثرت کی مظہر ثابت ہوئی۔

اُردو مذکورہ بالا زبانوں کے الفاظ وتراکیب کا حسین امتزاج ہے۔اُردو اپنے سرمایۂ الفاظ اورآوازوں کے لحاظ سے دنیا کی مقبول ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔انسانی ذہن سے ادا ہونے والی تقریباً تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس کے رسم الخط میں بھی اتنی جامعیت؛ اتنی قوت اور لچک موجود ہے کہ وہ دنیا کی زبانوں کی بیشتر آوازوں کو اصل شکل میں برقرار رکھ سکتا ہے۔

اردو کی قوسِ قزاح میں یہ رنگ اتنے سلیقے سے سموئے ہوئے ہیں کہ اب گویا بین الاقوامی زبانوں کی انجمن اور اقوامِ متحدہ ہے۔اُردو کا مزاج اس قدر امتزاجی (Electic) ہے کہ اس میں شرکت کے دروازے دنیا کی ہر زبان کے لیے کھلے ہیں۔اس میں انجذاب اور لچک کی اتنی زبردست لسانی توانائی موجود ہے کہ اکثر اوقات دوسری زبانوں کے الفاظ کو اردو میں منتقل کرتے وقت تصریف وتارید کے عمل کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

اردو زبان کی ترکیب وتشکیل میں عربی، فارسی، ترکی اور مقامی زبانیں خاص طور پر شامل ہیں۔عربی کا تعلق سامی السنہ سے ہے۔ترکی کا تعلق تورانی خاندان، فارسی کا تعلق ایرانی اور مقامی زبانوں کا تعلق ہندآریائی خاندانوں سے ہے۔اس طرح اردو میں دنیا کے تمام بڑے بڑے لسانی خاندانوں کی نمائندگی موجود ہے۔ ہر زبان کے تین بنیادی نظام ہوتے ہیں:

۱۔ صوتیات

۲۔ قواعد

۳۔ اشتقاقیات

ان تینوں سطحوں پر اردو زبان پر تین لسانی خاندانوں (سامی،ایرانی اور ہندآریائی) کے اثرات پائے جاتے ہیں،جس کی وجہ سے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں بے حد تنوع اور رنگا رنگی ملتی ہے اور اردو کا لسانی اُفق بہت وسیع ہوگیا ہے۔اس طرح اردو کو لسان الارض کہنا بے جا نہ ہوگا۔اس کے خمیر اور اجزائے ترکیبی میں مختلف زبانوں کی خصوصیات اور خون شامل ہے۔اس کا خمیر محبت ویگانگت، رواداری اور ملنساری کے حسین اور خوبصورت جذبات سے تیار ہوا اور یہ مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کے اختلاط وارتباط کا شاہکار ہے۔اردو زبان کے تمام

نظاموں: خواہ وہ صوتی ہوں یا قواعدی یا معنویاتی، ان میں امتزاج و اختلاط کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کسی بھی زبان کی ساخت اور ترکیب میں تین عناصر اہم ہوتے ہیں:

۱۔ حروفِ تہجی

۲۔ الفاظ

۳۔ مرکبات

ان تینوں عناصر کی نوعیت اور کیفیت اردو کی ہمہ گیری اور وسعت کی دلیل ہے۔

اردو نے افعال و قواعد مقامی زبانوں سے، مرکبات و تراکیب فارسی سے، عروض و اوزان عربی سے اور جدید سائنسی اصطلاحات و اختراعات انگریزی سے اخذ کی ہیں۔

ایک زندہ اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دے اور جب کوئی نیا دور آئے تو نئے خیالات، نئی طرزِ ادا، جدید ادبی رنگ اور ڈھانچوں کو اپنے اندر سمو لے۔ اردو میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور اپنی اس لچک اور انجذ ابی فطرت کی بنا پر اتنی کم عمری میں بھی السنۂ عالم میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اردو نے اپنی بساط کے مطابق: دوسری زبانوں سے خوب استفادہ کیا۔ عربی سے اردو کا علمی رنگ اُبھرا۔ فارسی تراکیب سے شیرینی اور خوبصورتی پیدا ہوئی۔ خالص ہندی ذخیرے سے موسیقیت اُبھری اور دیگر مقامی اور دیسی عناصر نے ان خصوصیات کو استحکام بخشا۔

اردو میں تمام رنگ اور ذائقے موجود ہیں۔ چنانچہ قندِ پارسی کی چاشنی، ام اللسان کی حلاوت، انگریزی کی رنگینی اور ہندی کی کوملتا سب کچھ موجود ہے۔

بقولِ ڈاکٹر سلیم فارانی:

''اس میں فارسی کی شیرینی، برج بھاشا کا درد، عربی کی جامعیت اور شان و

شوکت اور انگریزی کی روانی ہے۔فرانسیسی کی طرح یہ جذبات کے اظہار میں مکمل ہے اور جرمنی کی طرح اس میں رعب و جلال اور زور بھی موجود ہے''۔(۱۱)

اردو کا دوسری زبانوں سے تعلق واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر عطش درانی رقم طراز ہیں:

''اس (اردو) نے قدیم دراوڑی زبانوں میں جڑیں پکڑی ہیں تو ہند آریائی زبانوں میں پروان چڑھی ہے۔سامی اور تورانی زبانوں نے اسے برگ و بار عطا کیے ہیں تو ہند یورپی زبانوں کی فضا سے بھی اس نے رابطہ جوڑا ہے۔اردو میں جہاں قدیم سنسکرت، پہلوی اور فارسی کا ذخیرۂ الفاظ ہے، وہیں جدید ہندی، فارسی، عربی، ترکی زبانوں کا آمیزہ بھی ہے۔اس میں پراکرتوں، مثلاً: پالی، پشاچی، شورسینی، برج بھاشا، اپ بھرنش سے لے کر دکنی زبانوں: تلگو، ملیالم، تامل، کرناٹکی، کنٹری، نیز بنگلہ، آسامی تک اور سندھی، پنجابی، لنڈا، جٹکی، پشتو، ملتانی، بلوچی، براہوی تک کے الفاظ موجود ہیں۔اس نے یورپی زبانوں، مثلاً: یونانی، ہسپانوی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی سے بھی کسبِ فیض کیا ہے''۔(۱۲)

اگرچہ اردو نے اپنی ضرورت کے مطابق مقامی اور بیرونی ہر زبان سے استفادہ کیا، لیکن اپنے داخلی نظام میں ایک لسانی توازن قائم رکھا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اُردو میں مختلف رنگوں کی آمیزش کو یوں بیان کیا ہے:

''میں اردو کو زبانوں کا تاج محل کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں

۔زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی، فارسی، ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگا رنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول وعرض میں آج لنگوا فرینکا بھی ہے اور ایسا ادبی اظہار بھی، جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں''۔(۱۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی اردو کے بنیادی اور داخلی مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عربی و فارسی اور اردو کے علمائے زبان نے ذخیرۂ الفاظ کو بلحاظِ قواعد تین خاص گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ اسم(Noun)

۲۔ فعل(Verb)

۳۔ حرفِ جار(Prepostion)

ان میں صرف اسم کا ذخیرہ ایسا ہے، جس میں مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ انگریزی، عربی، فارسی، ترکی اور بعض دوسری زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت شامل ہیں، لیکن فعل جسے زبان میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کے بغیر بامعنی فقرہ وجود میں نہیں آ سکتا، اس کی نوعیت اسم کے ذخیرے سے بہت مختلف ہے۔اردو کے سارے افعال اور ان کے مصادر، مثلاً: پڑھنا، لکھنا، سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا اور کھانا، پینا وغیرہ یکسر مقامی ہیں۔یہی کیفیت حرفِ جار یا پری پوزیشن (Preposition) کی

ہے۔ اردو میں عام طور پر استعمال ہونے والے سارے حروفِ جار، مثلاً
: نے، کو، سے، میں، تک، ساتھ، وغیرہ بیرونی نہیں، مقامی زبانوں سے تعلق
رکھتے ہیں۔ اردو میں فعل اور حرف کی یہ مقامیت ظاہر کرتی ہے کہ اردو کا حقیقی
اور اساسی تعلق باہر کی زبانوں سے نہیں، علاقائی زبانوں سے ہے''۔(۱۴)

اردو نے عربی اور فارسی سے بھرپور استفادہ کیا۔ چونکہ عربی مذہبی اور فارسی تہذیبی زبان تھی، اس لیے اردو جیسی نومولود زبان کے لیے ایسی بلند پایہ علمی و ادبی زبانوں سے استفادہ ناگزیر تھا۔ تاہم اردو کا داخلی مزاج مقامی اور علاقائی رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اردو کی ساخت اور ہیئتِ ترکیبی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر افعال مقامی ہیں اور عربی و فارسی سے استفادہ زیادہ تر اسما تک ہی محدود ہے۔ زبانِ اردو کی صرف ونحو، روزمرہ ومحاورات اور مقامی الفاظ کی کثرت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس کی ساخت مقامی ہے۔ اُردو زبان کے سرمایۂ الفاظ میں مقامی اور دیسی الفاظ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

بقولِ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ:

''اگرچہ اردو نے مختلف غیر ہند آریائی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی سے بے شمار الفاظ مستعار لیے ہیں، لیکن اردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں، جو اہمیت ہندی الاصل الفاظ کو حاصل ہے، وہ کسی اور زبان کے الفاظ کو حاصل نہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہندی الاصل الفاظ کے استعمال کے بغیر اردو کا کوئی جملہ تشکیل نہیں پاسکتا، جبکہ اردو میں ایسے بے شمار جملے بن سکتے ہیں، جن میں ایک بھی عربی، فارسی لفظ استعمال نہ ہوا ہو۔ نثر میں انشاءاللہ خان انشا کی رانی کیتکی کی کہانی اور نظم میں آرزو لکھنوی کی سریلی بانسری ایسی ہی مثالیں ہیں،

جن میں بجز ہندی الفاظ، عربی فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے''۔(۱۵)

اردو کا مزاج عوامی اور جمہوری ہے۔ اگر چہ اردو کا تعلق درباروں سے بھی رہا ہے، لیکن اس تعلق نے اس کے عوامی اور جمہوری مزاج کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ جہاں تک اردو کے درباری زبان ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو اردو نے نہیں، بلکہ خود درباروں نے اردو کی عوامی مقبولیت اور ہردلعزیزی کے باعث اس سے ناطہ جوڑا۔ دکن میں بھی عوام کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے اسے درباری زبان بنایا گیا اور دہلی میں بھی یہ اس وقت اردوئے معلیٰ بنی، جب مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی کو بھی زوال آ گیا تھا۔ تاہم جہاں یہ شاہی درباروں میں مشاعروں اور قصیدوں کی زبان بنی، وہاں یہ بازاروں، گلی کوچوں، فقیروں کے تکیوں اور غریبوں کی جھونپڑی میں بھی نظر آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ صوفیائے کرام جیسے نفوسِ مقدسہ نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور انھیں کے سایۂ عاطفت میں اس نے چلنا سیکھا۔

تصریف وتارید اُردو کی ایک اہم خاصیت ہے۔ اردو زبان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس نے اخذ واستفادے کے معاملے میں اپنی پرائی اور ملکی وغیر ملکی زبان کا فرق روا نہ رکھا اور کسی زبان سے بھی بغض اور بیگانگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس ملنسار فطرت کی بنا پر مستعار او ردخیل الفاظ اردو کے لسانی و ادبی سرمائے کا قابلِ قدر ذخیرہ ہیں اور اس کی آمیزش وآویزش، جذب وادغام اور اختلاط وارتباط کی فطرت ہی اِس کی ترقی کا سبب ہے۔ اُردو اپنی باطنی اور تخلیقی استعداد، جذب وقبول کی خلقی اہلیت اور ساختی لچک کے باعث ہر قسم کے اسلوب کو سمونے اور ہر طرح کے خیالات وافکار کے اظہار وابلاغ پر قادر ہے۔ اگر کسی لفظ کا

برمحل ترجمہ نہ ہوسکے تو تشریح کی ضرورت نہیں۔ اِسے فی نفسہٖ اِسی صورت اس طرح اپنالیتی ہے کہ صوتی بیگانگی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ چاہے وہ لفظ کسی بھی لسانی خاندان کی زبان کا ہو۔ ان مستعار اور دخیل الفاظ سے اردو زبان وادب کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ جہاں احساسات وخیالات میں لطیف سے لطیف فرق کو بھی مختلف النوع مرادفات ومترادفات کے ذریعے آسانی سے ادا کیا جاسکتا ہے، وہاں اسلوب میں بھی تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوگئی۔

اردو نے بعض الفاظ کو اپنی زبردست، انجذابی قوت کی بنا پر بغیر کسی صوتی اور معنوی تحریف کے اختیار کرلیا۔ ان کو ہم مستعار الفاظ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور وہ الفاظ، جنھیں اُردو نے اپنی سان پر چڑھا کر اپنے سانچے کے مطابق تراش خراش کر کے شامل کیا، ان کو دخیل الفاظ کہتے ہیں۔ دخیل الفاظ میں تصرف کا یہ عمل: تلفظ، معنی، مرکبات، قواعد غرضیکہ زبان کے سارے پہلوؤں کو محیط ہے۔ تلفظ کے معاملے میں فتحۂ خفیف، کسرۂ خفیف، ضمۂ خفیف (احمد، محبوب، محمود، اعتماد، احتیاط، اہتمام، مہمل، عہدہ) اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اسی طرح قمیص کی بجائے قمیض، سیِّد اور جیِّد کی بجائے سَیّد اور جَیّد، حرکت، برکت وغیرہ میں دوسرے حرف پر حرکت کی بجائے سکون اردو کا تصرف ہے۔ مشدد کو مخفف کر دیا گیا، مثلاً: سِرّ کی بجائے سر، درّ کی بجائے در وغیرہ۔ اسی طرح فارسی کے جزو کی بجائے جز، جُوق در جُوق کی بجائے جَوق در جَوق، ترکی کے خانُم اور بیگُم کی بجائے خانَم اور بیگَم۔ انگریزی میں Match Box کی بجائے ماچس، lantern کی بجائے لالٹین، Bottle کی بجائے بوتل اور Captain کی بجائے کپتان وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

اُردو نے الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی تصرف کیا ہے۔ عربی کا لفظ اہلیہ بمعنی صلاحیت بجائے بیوی کے، رقیب بمعنی نگہبان بجائے حریف کے اور خصم بمعنی دشمن بجائے

شوہر کے استعمال ہوتا ہے۔مصادر میں بھی اردو کا تصرف قابلِ دید ہے، مثلاً: نوازنا، بخشنا،قومیانا، بدلنا،فلمانا وغیرہ۔مرکبات میں بھی عربی و فارسی کے ساتھ ہندی اورانگریزی کا پیوندلگادیا گیاہے،مثلاً: گاڑی بان، پان دان، نیک چلن،گلاب جامن(ہندی + فارسی)، چال باز، دھینگا مشتی، چوکی دار،تھانے دار،ڈاک خانہ،بیل گاڑی،جیل خانہ،ٹکٹ گھر وغیرہ۔

اردو نے قواعد کے معاملے میں بھی عربی وفارسی سے بہت کچھ لیا،لیکن جہاں ضرورت پڑی، اپنے مزاج کے مطابق قواعد کے اصولوں کا اطلاق کیا، مثلاً:عربی لفظ اولاد کو جمع کی بجائے واحد استعمال کیا اور اولاد کی جمع اردو قاعدے کے مطابق اولادیں بنادی۔اسی طرح عربی میں پرندے کو طیر کہتے ہیں،جس کی جمع طائر ہے،جبکہ اردو میں طائر واحد ہے اوراس کی جمع فارسی قاعدے کے مطابق طائران ہے۔شمس بمعنی سورج عربی میں مؤنث اوراردو میں مذکر ہے۔کتاب عربی میں مذکراوراردو میں مؤنث ہے۔

اردو اپنے نظامِ صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی مزاج کی حامل زبان ہے۔اس میں عربی، فارسی، ترکی،انگریزی اور مقامی بولیوں کے ہی نہیں، بلکہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں،لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اردو اپنی ساخت اورفطرت میں کسی خاص زبان کی مقلد اور ظلِ ثانی ہے، بلکہ یہ سیرت وصورت دونوں اعتبار سے ایک الگ اور مستقل زبان ہے اوراپنی صناعی، زیبائی اور افادیت کے لحاظ سے منفرد مزاج، الگ رنگ وآہنگ اورامتیازی کلچر کی حامل ہے۔اس نے دوسری زبانوں کے الفاظ کوتصریف وتارید کے عمل سے گزار کر اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا ہے اور بہت سے الفاظ کے تلفظ ومعنی، ان کا املا اوراستعمال کی نوعیت بدل گئی ہے۔اردو کا اپنا مخصوص لب ولہجہ،

اپنی لغت، اپنا اسلوب، اپنے قواعد اور فصاحت و بلاغت کے اپنے اصول اور معیار ہیں۔حروف سے لے کر الفاظ اور جملوں کی ساخت تک،قواعد وگرامر،تذکیر وتانیث کے اصول،واحد جمع کے قاعدے اور صحتِ تلفظ کے معیار کے اعتبار سے اس کا اپنا مخصوص پیمانہ اور خاص انداز ہے۔

سید انشاءاللہ خان انشا نے آج سے تقریباً دوسو سال پہلے اردو کے مزاج،فصاحت اور صحت کے بارے میں فیصلہ صادر کیا تھا، جسے اُردو کی لسانی آزادی کا میگنا کارٹا کہنا بے جا نہ ہوگا:

''جاننا چاہیے کہ جو لفظ اُردو میں آیا،وہ اُردو ہوگیا۔ خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی؛ ترکی ہو یا سریانی؛ پنجابی ہو یا پوربی،اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔اس کی صحت و غلطی اس کے اُردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے، کیونکہ جو چیز اُردو کے خلاف ہے،وہ غلط ہے۔گو اصل میں صحیح ہو اور جو اُردو کے موافق ہے، وہی صحیح ہے،خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو''۔(۱۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

''اردو ادب نے بعض شعبوں میں یقیناً فارسی وعربی کی تقلید کی ہے،لیکن اس تقلید کا تعلق اردو کے باطن سے نہیں، بلکہ صرف ظاہر سے رہا ہے۔اردو شاعری نے وزن، بحر اور اصنافِ سخن، مثلاً: غزل، قصیدہ، رباعی اور مثنوی وغیرہ میں بے شک عربی، فارسی دونوں کی پیروی کی ہے،لیکن اپنے اثر،لب و

لہجہ اور موضوع کے اعتبار سے اردو ادب یا شاعری، فارسی اور عربی سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ نثر میں اردو افسانہ، ڈرامہ، ناول اور تنقید وغیرہ کے شعبے ایسے بلند معیار کو پہنچ گئے ہیں کہ موجودہ فارسی یا عربی ان سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ اس لیے اردو کو مخلوط یا مشترک زبان کہہ کر یہ مراد لینا کہ وہ دوسری زبانوں کی محض نقل ہے، درست نہیں ہے۔ جیسا ابھی کہا گیا ہے اردو اپنے لب و لہجہ، رکھ رکھاؤ، روزمرہ، محاورہ، اندازِ بیان، موضوع و مواد اور مختلف الفاظ کے استعمال و ایجاد کے لحاظ سے ایک علیحدہ زبان ہے۔ اس نے اپنی ساخت، مرکبات کے اصول و قواعد میں ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی وہ کسی کی پابند نہیں رہی، بلکہ اس نے اپنی لغت، اپنا اسلوب، صرفی و نحوی قاعدے، واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول الگ بنا لیے ہیں اور انھیں کی پابندی اردو کی فصاحت و بلاغت اور حسن و اثر کا معیار متعین کرتی ہے''۔(۱۷)

بلاشبہ اردو نے دوسری زبانوں سے بہت کچھ لیا، لیکن استفادہ کرتے وقت ایک آزاد اور خودمختار زبان کی حیثیت سے کاٹ چھانٹ کی اور الفاظ کو اپنی کسوٹی پر پرکھا، جو مزاج کے موافق تھے، انھیں اپنا لیا، جنھیں ہم مستعار الفاظ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جو طبیعت کے خلاف تھے، ان میں تبدیلی اور تصرف کیا، جسے ہم تارید کا نام دیتے ہیں۔ یہ تصرف حروفِ تہجی کی آوازوں سے لے کر الفاظ کے تلفظ، ان کے معانی اور املا غرض ہر شعبے میں ہوا۔

نصیر احمد خان کے الفاظ میں:

''اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی

طرح اس کی اپنی تاریخ ہے؛ اپنا لسانی عمل ہے؛ اپنے ارتقائی مدارج ہیں ؛اپنی قواعد ہے؛ ہیئت وتشکیل کے اپنے اصول ہیں؛ اپنا معیار ہے اور اپنا رسم الخط بھی ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں، جنھوں نے مل کر اردو کی انفرادیت کو سنوارا اور نکھارا ہے''۔(۱۸)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اُردو کے انفرادی مزاج کی یوں عکاسی کی ہے:

''اردو خواہ کیسی خوشہ چیں زبان ہو اور اس نے کہاں کہاں اور کس کس کے گل بوٹوں سے اپنے دامن کو سجایا ہو، اس کا داخلی نظام اس کا اپنا نظام ہے۔ اردو بے شک عربی، فارسی اور ہندی سنسکرت کی احسان مند ہے کہ ان سے اردو میں کیا کیا کچھ آیا اور خود اردو نے اپنے باطنی تحرک اور اپنے حسن ولطافت سے اس میں کیا کیا اضافے کیے، لیکن اردو کے اپنے داخلی نظام کے معاملات میں ان میں سے کوئی بیرونی زبان حکم نہیں ہوسکتی۔ اردو کے لسانی معاملات میں قولِ فیصل کسی دوسری زبان کا نہیں خود اردو کا اپنا ہوگا، یعنی اردو کے داخلی نظام کی رو سے ہوگا۔ کسی بھی زبان کی لسانی خود مختاری اور آزادی کی بنیاد یہی ہے۔ اس نظام کو سمجھنا اور اس کی روشنی میں مسائل کو حل کرنا، اردو کی روح سے ہم کلام ہونا اور اس کے مزاج سے انصاف کرنا ہے''۔(۱۹)

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اردو کی لچک اور انجذابی کیفیت کی وجہ سے یہ خلطِ مبحث ہوا کہ اسے مخلوط اور مرکب زبان کہا جانے لگا اور اس کا مفہوم یہ سمجھا جانے لگا کہ شاید اردو کا سب کچھ بیگانے کا ہے اور اس نے اِدھر اُدھر سے الفاظ وتراکیب لے کر اپنا دامن بھرا ہے اور بھان متی کا کنبہ جوڑا ہے۔ جہاں تک اخذ واستفادے کا تعلق ہے تو دنیا کی

کوئی زبان بھی خالص اور دوسری زبانوں کے اثرات سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور ان معنوں میں تو دنیا کی ہر زبان مخلوط زبان ہے۔

اردو نے دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اخذ و استفادے سے کام لیا، لیکن دنیا کی بڑی زبانوں کی طرح اردو زبان کے بھی اپنے اصول، قاعدے، پیمانے اور معیارات ہیں اور ہر داخلی اور مستعار لفظ کو اردو نے اپنی کسوٹی پر پرکھ کر اختیار کیا۔ مخلوط زبان کا مطلب تو یہ ہوا کہ اختیار کیے گئے الفاظ کو اردو نے تراش خراش اور کاٹ چھانٹ کے بغیر بعینہٖ اپنا لیا اور اب ان الفاظ و تراکیب اور اسما و افعال میں اصل زبان ہی کی پیروی کرتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اردو اپنے داخلی نظام کی بنا پر ایک منفرد، مستقل، آزاد اور خود مختار زبان ہے۔ ایسی صورت میں اردو کو محض ایک مخلوط زبان کہنا یا سمجھنا اردو کے مزاج، اس کی ساخت و ہیئت اور اس کی تاریخ و ارتقا سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔ یہ انتہائی غلط مفروضہ ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ دو یا تین یا اس سے زائد زبانوں کی ملاوٹ سے ایک نئی زبان بن جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو متعدد مخلوط زبانیں وجود پذیر ہو چکی ہوتیں۔ ایسی ہی مصنوعی زبان 'اسپرانتو' بنانے کی کوشش کی گئی اور باوجود زرِ کثیر صرف کرنے کے اس کا وجود قائم نہ رہ سکا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان شعوری کوشش سے نہیں بنائی جا سکتی، بلکہ زبان کا ارتقا فطری عمل ہے، جس کے لیے صدیوں کا عرصہ درکار ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا ہے:

''یہاں دو ایک غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے، جو بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح جم بیٹھ گئی ہیں کہ نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ ایک غلط فہمی، جسے میں سب سے زیادہ خطرناک اور لسانی بحثوں میں

حقیقت سے بھٹکانے والی سمجھتا ہوں، یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی تیسری زبان وضع کی جاسکتی ہے، جو پہلی دو زبانوں سے جدا اور آزاد ہو۔ دو یا دو سے زیادہ رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا اور دونوں سے مختلف رنگ ضرور تیار کیا جاسکتا ہے، لیکن دو زبانوں کی ترکیب سے کسی تیسری زبان کی تعمیر ناممکن ہے''۔(۲۰)

ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

''زبان میں دخیل اور مستعار ذخیرۂ الفاظ اس قدر اہم نہیں کہ اس کی بنا پر ایک زبان کو ملغوبہ اور مرکب کہا جاسکے۔ زبانوں کی ساخت میں صرف ونحو کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ محض فرہنگِ الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں۔ زبان کی ساخت کا انحصار، افعال، اعداد، ضمائر، حرف، بنیادی اسما اور قواعد پر ہوتا ہے۔ اردو میں جہاں تک ان عناصر کا تعلق ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اردو کے بنیادی تشکیلی عناصر کی فہرست دیکھیے:

۱۔ بنیادی افعال، مثلاً: آنا، جانا، کھانا، پینا، چلنا، بیٹھنا، سونا وغیرہ

۲۔ بنیادی اعداد، مثلاً: ایک، دو، تین، دس، بیس، سو وغیرہ

۳۔ بنیادی رشتے، مثلاً: ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی وغیرہ

۴۔ اہم اعضائے جسم، مثلاً: آنکھ، کان، ناک، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ

۵۔ بنیادی ضمائر، مثلاً: میں، ہم، تم، وہ وغیرہ

۶۔ بنیادی حروف، مثلاً: نے، کو، سے، پر، میں، تک وغیرہ''۔(۲۱)

مندرجہ بالا فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی تشکیلی عناصر اور افعال مقامی اور اردو

کے اپنے ہیں۔دوسری زبانوں،مثلاً:عربی، فارسی وغیرہ سے مستعار ذخیرۂ الفاظ زیادہ تر اسما پر مشتمل ہے۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی زبان بھی دوسری زبانوں اور بولیوں سے اخذ و استفادہ اور لین دین کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔تنہائی اور جمود زبان کی موت کا باعث ہے۔سنسکرت کی مثال سامنے ہے۔اگر ہم انگریزی ہی کو لیں تو اس میں بڑی تعداد لاطینی الاصل الفاظ کی ہے۔اس میں جرمن اور فرانسیسی ذخیرۂ الفاظ کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو اردو میں عربی و فارسی کو ہے۔اگر عربی فارسی حروفِ تہجی اور ذخیرۂ اسما کی آمیزش کے باعث اردو کو مخلوط زبان کہیں تو ایسی صورت میں عربی، فارسی، انگریزی غرضیکہ دنیا کی بیشتر زبانوں کو مخلوط کہنا پڑے گا۔

دوسری غلط فہمی، جو تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی کسی حد تک مقبول ہے کہ اردو ایک لشکری زبان ہے۔یہ تو بجا ہے کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے،جس کا معنی ہے: لشکر یا فوجی چھاؤنی،لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ لشکری زبان ہے؟ جہاں تک نام کا تعلق ہے تو یہ نام شروع سے اس زبان کا نہ تھا، بلکہ مختلف ادوار میں یہ زبان ہندی، ہندوی، دکنی، گوجری، لاہوری، دہلوی، ریختہ اور اردوئے معلٰی جیسے ناموں سے موسوم رہی۔اُردو نام تو آخر میں رائج ہوا،اس لیے صرف نام کی بنیاد پر اردو کی تاریخ کو قیاس کرنا اور اسے لشکری زبان کہنا انتہائی گمراہ کن بات ہے۔علامہ ماہرالقادری نے اس مفروضے کی یوں تکذیب کی ہے:

اس کو قوموں کے تمدن نے کیا ہے پیدا
کون کہتا ہے لشکر کی زباں ہے اردو

تیسرا غلط مفروضہ، جس کی وجہ سے برِصغیر میں لسانی تعصب کو ہوا ملی، وہ یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلاشبہ اردو کی پیدائش مسلمانوں کی آمد کے اثرات کا نتیجہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اسے ساتھ لائے تھے، بلکہ مسلمان حملہ آور تو ترکی اور فارسی بولتے ہوئے آئے تھے۔ اردو اپنی فطرت کے اعتبار سے خالصتاً برِصغیر کی مقامی زبان ہے۔ اگر چہ اردو نے ایک نوخیز اور ترقی پذیر زبان کی طرح عربی جیسی علمی اور فارسی جیسی تہذیبی زبان سے بھرپور استفادہ کیا، لیکن اس کا خمیر اسی زمین سے اُٹھا ہے۔ اس کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ اور افعال وغیرہ مقامی ہیں۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اپنی تصنیف اردو کی لسانی تشکیل میں سراغ لگایا ہے کہ:

''اردو کے زیادہ تر ہائیہ اور معکوسی مصمتے، نیز بنیادی مصوتے سنسکرت میں موجود تھے''۔(۲۲)

اردو ایک ہند آریائی زبان ہے اور یہ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کے ارتباط کی یادگار ہے۔ یہ ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ اور برِصغیر کی Lingua Franca ہے۔ اُردو ایک مہذب اور شائستہ زبان ہے۔ اُردوئے معلیٰ جیسی خوبصورت ترکیب ہی اس کی نفاست اور ذوقِ لطیف کی آئینہ دار ہے۔ پھر لفظ اُردو ہی کو لیں۔ ایسے حروف جو بے جوڑ ہیں۔ نہ نقطہ، نہ دائرہ؛ نہ کشش، نہ پیوند اور سب سے چھوٹے اور لکھنے میں آسان۔ اس کا نام ہی کفایتِ حرفی اور سبک خرامی کی دلیل ہے۔ اُردو زبان اپنی ترکیب کی شستگی اور اسلوب کی پاکیزگی کے لحاظ سے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیرینی اور لطافت، نفاست اور نزاکت اُردو زبان کی مہتم بالشان خاصیت ہے۔ اس کے اسلوبِ بیان سے اس کے بولنے

والوں کی خوش مزاجی، فطری پاکیزگی اور دل نوازی مترشح ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ محبانِ اُردو اور بانیانِ اُردو نے دوسری زبانوں کے نرم و نازک، لطیف و رنگین اور حسین و جمیل الفاظ چن چن کر اپنے گنجینے میں داخل کیے۔

انشاء اللہ خاں انشا دہلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہاں کے خوش بیانوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعض عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی، جس کا نام اُردو رکھا''۔(۲۳)

اُردو کو یہ امتیاز اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں اُردوئے معلیٰ بنی رہی اور اس میں دربار و شہرِ دہلی کی متمدن، مہذب اور آدابِ مجلسی کی حامل زندگی شامل ہوگئی۔ دوسری طرف صوفیہ اور اولیاء کی مقدس گود اور پاکیزہ ماحول میسر آنے کی وجہ سے محبت و رواداری اور احترامِ آدمیت اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ تخاطب میں احترام کا لہجہ اور اور اظہارِ شائستگی اُردو کے اسلامی اور مشرقی مزاج کی عکاس ہے۔ چنانچہ مخاطب کے لیے القاب و آداب اور حفظِ مراتب کا، جو اہتمام اُردو میں ہے، وہ شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو۔ احترام اور شائستگی کا یہ اسلوب اُردو زبان کی تہذیب اور کلچر کا طرۂ امتیاز ہے۔

فرمایئے؛ تشریف رکھیے؛ ارشاد کیجیے؛ سماعت فرمایئے؛ نوش کیجیے؛ تکلیف مت کیجیے؛ جناب!؛ حضور!؛ جنابِ عالی!؛ اسمِ گرامی؟؛ آپ کی تعریف؟ جیسے عمدہ اور خوبصورت الفاظ اُردو کا ہی خاصہ ہیں۔

مخاطب معاشرتی لحاظ سے کتنا ہی نچلے درجے کا کیوں نہ ہو، اس کے جذبات اور عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا ہے، مثلاً: بھنگی کو مہتر، حلال خور اور جمعدار کہا جاتا ہے اور کند ذہن اور

ناسمجھ کو خوش فہم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اُردو کی ایک اور خاصیت اس کی شیرینی اور غنائیت ہے۔ اس کے لب و لہجے کا صوتی آہنگ اور نغمگی براہِ راست اعصاب پر اثر انداز ہو کر ان پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ اردو حروفِ تہجی میں بھی غنائی کیفیت نظر آتی ہے اور جملہ بھی نئے نئے رنگ روپ بدلتا ہے۔ بقولِ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر:

> ''اُردو زبان تصریفی اور تحلیلی طرزِ اظہار کے اسالیب کے مابین اپنے جملے کی ساخت اور پرداخت کرتی ہے۔ اس سے اُردو جملہ لسانی رنگا رنگی کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ اس کا اسلوبیاتی آہنگ داخل اور خارج کی معنوی فضا سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے اور لسانی جمالیات کی رعنائی سے بھی۔ اُردو میں جملہ سازی کے قرینے اتنے Verstile ہیں کہ انھیں قواعدی اصولوں کے تناظر میں پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ملا وجہی سے لے کر قرۃ العین حیدر تک پچاسوں صاحبِ طرز اسلوب نگاروں کے ہاں جملوں کی تخلیقی رنگا رنگی قواعد کے پیمانوں سے ماپی اور تولی نہیں جا سکتی، البتہ انھیں اسلوبیاتی آہنگ کے قرینوں سے پرکھا جا سکتا ہے''۔(۲۴)

حوالہ جات

۱ . **نور الحسن،مولوی:** نور اللغّات: **سنگِ میل پبلی کیشنز، لاھور: ۱۹۸۹ء :ص ۲۳۳.**

۲ .**شان الحق حقی:** فرہنگِ تلفظ: **مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد: ۲۰۰۲ء:ص ۵۸۹.**

۳۔ اُردو لغت *(تاریخی اصول پر)،جلد یازدہم: اردو لغت بورڈ، کراچی: ۱۹۹۰ء:ص ۱۹۔*

۴۔ *حامد علی خاں،مولانا:* اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا *(جلد اول): شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: ۱۹۸۷ء:ص ۴۰۷۔*

۵۔ **سید محی الدین قادری، ڈاکٹر:** ہندوستانی لسانیات: **شمس الاسلام پریس، حیدر آباد دکن :طبعِ اول ۱۹۳۲ء:ص ۲۶.**

۶۔ **اقتدار حسین خان، ڈاکٹر:** لسانیات کے بنیادی اصول: **ایجوکیشنل بک ھاؤس، علی گڑہ: ۱۹۸۵ء:ص ۱۵.**

۷۔ القرآن الکریم: **سورۂ رحمن: آیت ۳و ۴.**

۸۔ *سلیم اختر، ڈاکٹر:* اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ: *مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۱۹۹۵ء:ص ۱۱۔*

۹۔ ہندوستانی لسانیات: ص ۱ ۵.

۱۰۔ *محولہ بالا:ص۵۳۔*

۱۱۔ *سلیم فارانی،ڈاکٹر*:اردو زبان اور اس کی تعلیم :*ادارہ مطبوعاتِ فارانی، لاہور:۲۰۰۰ء:ص۱۸۸۔*

۱۲۔ **عطش درانی، ڈاکٹر**: اردو اصطلاحات سازی :**انجمن الترقیه علمیه، اسلام آباد: ۱۹۹۴ء:ص ۳۹.**

۱۳۔ **گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر**: اردو زبان اور لسانیات:**سنگِ میل پبلی کیشنز، لاھور:۲۰۰۷ء: ص۱۰۴.**

۱۴۔ *فرمان فتح پوری،ڈاکٹر*:زبان اور اردو زبان:*حلقۂ نیاز ونگار،کراچی:۱۹۹۵ء:ص ۱۳۲و۱۳۳۔*

۱۵۔ **مرزا خلیل بیگ، ڈاکٹر**: اردو کی لسانی تشکیل : **ایجوکیشنل بک ھاؤس، علی گڑہ: ۱۹۹۰ء:ص ۱۷۸.**

۱۶۔ **انشا،سید انشا ء الله خان**:دریائے لطافت(**مترجم، پنڈت برج موھن دتا تریه کیفی**): **انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی:۱۹۸۸ء:ص ۳۵۳و۳۵۴.**

۱۷۔ **فرمان فتح پوری، ڈاکٹر**: تدریسِ اردو:**مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد:، ۲۰۰۳ء:ص ۵.**

۱۸۔ **نصیر احمد خان**:اردو ساخت کے بنیادی عناصر:**اردو محل پبلیکیشن، نئی دھلی : ۱۹۹۱ء:ص ۳۹.**

۱۹۔ اردو زبان اور لسانیات: **ص ۲۱۶**

۲۰۔ **شوکت سبز واری، ڈاکٹر**: داستانِ زبانِ اردو: **ھندوستان لیتھو پریس، دھلی: ۱۹۶۱ء: ص ۳۴، ۳۵**

۲۱۔ **گیان چند، ڈاکٹر**: لسانی رشتے: **مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاھور: ۲۰۰۳ء: ص ۷۰.**

۲۲۔ اردو کی لسانی تشکیل: **ص ۴۹**

۲۳۔ دریائے لطافت: ص ۲۔

۲۴۔ *عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر*: اُردو جملے کی ساخت میں سر اور آہنگ کی جلوہ آرائی *مطبوعہ در دریافت*: ***نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد:***

شمارہ سات: جنوری ۲۰۰۹ء: ص ۱۳۰

باب دوم

اردو کی تشکیل میں مشرقی زبانوں کا کرداراور مستقبل کا منظر

فہرست مندرجات

الف۔اردواورعربی
ب۔اردواورفارسی
ج۔اردواورترکی

اردو امتزاجی مزاج اور کثیر اللسان اثرات کی حامل زبان ہے۔ یہ جنوبی ایشیا کی سب سے مقبول زبان ہے۔ اردو نے ایک زرخیز اور ترقی پزیر زبان کی طرح اپنی تشکیلی مراحل پر دنیا کی ترقی یافتہ مشرقی زبانوں سے بھرپور اخذ و استفادہ کیا۔ اس مستعاریت کی وجہ سے اردو مشرقی زبانوں کا ذائقہ اور عکس پوری طرح موجود ہے۔ عربی ایک مذہبی اور فارسی ایک تہذیبی اور اقتدار کی زبان ہونے کے ناطے اردو پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئیں۔ ترکوں چونکہ مغلوں کی مادری زبان تھی، اس لیے مغلوں کے دورِ حکومت میں اس کا اردو پر اثر انداز ہونا لازمی امر تھا، تاہم دربار، امورِ حکومت اور تعلیم کی زبان فارسی ہونے کی بنا پر اس کے اثرات نسبتاً کم رہے۔ اس مضمون میں ماضی کے ساتھ حال میں بھی ان زبانوں کے اردو سے روابط کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

الف۔ اردو اور عربی:

اردو کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے اپنے خدوخال درست کرنے اور اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے عربی اور فارسی جیسی علمی اور ترقی یافتہ زبانیں میسر آئیں۔ عربی زبان اگر سامی السنہ ہے اور اردو ہند آریائی، لیکن عربی کے مذہبی اور علمی زبان ہونے کی وجہ سے اردو نے اس سے بہت استفادہ کیا۔ عربی زبان کا اثر صرف چند الفاظ تک محدود نہیں بلکہ اشتقاق کی بعض صورتیں اور دیگر لسانی خصوصیات بھی جو خاص عربی کا خاصہ ہیں؛ فارسی کے توسط سے اردو میں داخل ہوئیں۔ اردو میں مستعمل عربی ذخیرہ لسان کی ایک طویل فہرست ہے جس میں مذہبیات کے ساتھ سماجی و معاشرتی اور تعلیمی و ادبی تمام شعبوں سے متعلق ذخیرہ الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے۔ سید احمد دہلوی کے مطابق فرہنگِ آصفیہ میں شامل کل الفاظ

میں عربی الفاظ کی تعداد "۴۸۵۷" ہے۔ (۱)

اردو کا رسم الخط عربی ہے جسے مقامی آوازوں کی ادائیگی کے لیے حروف کی ایجاد واختراع اور اضافے کے ساتھ اختیار کرلیا گیا۔عربی حروف تہجی اور الفاظ کے ادغام سے اردو کی لسانی قوت کئی گنا بڑھ گئی۔

عربی کے لسانی ذخیرے سے اسما وصفات، مرکبات، محاورات اور ضرب الامثال کی کثیر تعداد نے اردو میں دخیل ہوکر اس کی شان وشوکت اور جن میں اضافہ کردیا۔اگر اس تنوع پر نظر ڈالیں تو ایک جہانِ معنی آباد ہے۔مثلاً:

افعال، تفعِیل، تفعل، مفاعلہ، تفاعل، اِفتِعال، اِستِفعال، انفِعال کے الفاظ کثرت سے ہیں۔ اسمِ فاعل (عالم)، اسمِ مفعول (معشوق) اسمِ صفت میں (شریر)، اسمِ تفصیل (اکثر)، اسمِ مبالغہ (علامہ) اسم ظرف (مسجد)، اسم آلہ (میزان) اسم عدد (والد(ین))، جنس (طالبہ) وغیرہ۔اسی طرح مرکبِ اضافی (راقم الحروف)، مرکب توصیفی (صدقہ جاریہ)، جار مجرور(فی الحال) وغیرہ۔تاہم ایسی تراکیب میں نحوی تعلق عربی کے اصول پر نہیں بلکہ فارسی واردو کے اصول پر ہے۔

مرکبات میں عربی وفارسی کے اشتراک سے بنی ہوئی تراکیب بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔مثلاً کتب خانہ، تربیت گاہ، حرف شناس، ترقی یافتہ، اعمال نامہ وغیرہ۔اردو قواعد (صرف ونحو) پر عربی قواعد کا گہرا اثر ہے۔اسم، فعل، حرف، اقسامِ فعل، اسم کی اقسام، جملے کی اقسام اور نحوی ڈھانچہ غرض اردو قواعد کا ایک معتد بہ حصہ عربی سے اردو میں داخل ہوا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر ہوا؛ اردو میں عربی کا لسانی سرمایہ زیادہ تر فارسی کے توسط

سے داخل ہوا۔ادبی سطح پر عربی نے اردو پر اثرات فارسی کے توسط سے مرتب کیے۔شاعری میں حمد،نعت،قصیدہ جیسی اصناف کا ابتدائی سراغ عربی ہی میں ملتا ہے۔نثر میں الف لیلی اور داستانِ امیر حمزہ جیسی داستانوں سے اردو میں داستان نویسی کے لیے رہبر کا کام کیا۔اردو کے عروض شعری کا ڈھانچہ بھی عربی سے لیا گیا۔ ہمارے بعض شعرا نے ہندی پنگل کو اپنانے کی کوشش کی مگر بحیثیتِ مجموعی عربی عروض ہی اردو شاعری میں مروج ہے۔

بہت سی تلمیحات عربی سے اردو میں آئیں مثلا اصحابِ کہف، اصحابِ فیل، یوسف زلیخا،حسین و یزید،قیس ولیلی ،حاتم طائی ،یدِ بیضا وغیرہ۔روزمرہ،محاورات اور ضرب الامثال کا بھی ایک قابلِ ذکر ذخیرہ عربی سے اردو میں منتقل ہوا۔مثلا: ہذامِن فضلِ ربی، الامان والحفیظ،امنا وصدقنا،صم بکم، ماشااللہ، لاحول ولاقو،الحمداللہ، فی امان اللہ،استغفراللہ،بسم اللہ، ان شااللہ،نعوذ باللہ،السلام علیکم،اللہ حافظ،واللہ اعلم باالصواب،نصر من اللہ وفتح قریب اورانا للہ وانا الیہ راجعون،جیسی تراکیب اور جملے معمول کی گفتگو اور تحریر میں رائج ہیں۔

محاورات میں آنتوں کا قل ھواللہ پڑھنا،صلوتیں سنانا وغیرہ اور ضرب الامثال میں ''افضل الاشغال خدم الناس، ، الاحتیاج ام الاحتراع ،الانسان مرکب من الخطا والنسیان،المکتوب نصف الملاقات ،خیر الامور اوسطھا،سید القوم خادمھم ،لکل داء دوا جیسی کہاوتیں اصل یا ترجمہ کی صورت میں موجود ہیں۔

اصطلاحات کے ضمن میں اردو میں عربی وفارسی کا وہی کردار ہے، جو لاطینی ،یونانی کا انگریزی میں ہے۔ ہماری مذہبی، ادبی، جغرافیائی،تعلیمی، قانونی اور سائنسی اصطلاحات کا بڑا حصہ عربی وفارسی سے لیا گیا ہے۔

ساخت اور مزاج کے اعتبار سے دو خودمختار زبانیں ہونے کے سبب اردو اور عربی میں

اختلافات بھی ہیں۔عربی میں اردو کی بہت ساری آوازیں نہیں،مثلا:

فارسی صوتے: پ چ ژ گ

معکوس یا ہکاری صوتے: ٹ ڈ ڑ

ہائیہ آوازیں: بھ پھ تھ ٹھ وغیرہ۔

عرب ان صوتیوں کی ادائیگی نہیں کرسکتے۔اسی طرح اہلِ اردو کے لیے ض غ ق کی ادائیگی مشکل ہے۔ مشابہ الصوت حروف کو بھی اہلِ اردو تقریبا یکساں طریقے سے ادا کرتے ہیں۔واوٴ مجہول،یائے مجہول،فتحہ خفیف،کسرہ خفیف،ضمہ خفیف کی ادائیگی عربوں کے لیے نامانوس ہے۔

اردو میں عربی کا ذخیرہ الفاظ دوطرح کا ہے۔ایک عربی الاصل (مستعار)اور ثانیا جس میں اردو نے تحریف وتارید کرلی ہے،جنھیں دخیل الفاظ کہتے ہیں۔اس طرح اردو میں بہت سے عربی الفاظ کے تلفظ مثلا:حرکت، خزانہ، رشوت،صدقہ،سفارت اور معانی مثلاً: اجازت،جلسہ،حلیہ،غریب،انجمن،قسمت،مذاق،ہجوم وغیرہ میں اختلاف ہے۔بہت سے عربی الفاظ کی تنوین مثلامحل،غم (غم")،حد(حد")جبکہ جن،حق،شک،حب،رد وغیرہ کی تشدید اردو میں حذف کرلی گئی ہے۔

قواعد میں بھی بہت سے عناصر اختلافی ہیں۔مثلا کتاب،کرسی،منزل،عربی میں مذکر ہیں اور اردو میں مونث،اسی طرح مدرسہ،محکمہ،مقبرہ،عربی میں مونث اور اردو میں مذکر ہیں۔جسم کے اعضا مثلا ہاتھ،پاؤں،کان وغیرہ عربی میں مونث ہیں جبکہ اردو میں مذکر۔

عربی کے مرکبات میں مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں آتا ہے۔مثلا بیت المال، دارالحکومت،واجب الاداوغیرہ۔اردو میں صفت اسم سے پہلے آتی ہے ہے جبکہ عربی میں اسم

کے بعد مثلا: رجلعقل (عقل مند آدمی)۔عربی مونث کی صفت بھی مونث کی شکل میں ہوگی۔ مثلا اِمراہ جمیل (خوبصورت عورت) جبکہ اردو میں ایسا نہیں۔

مرکبِ اضافی کی ترتیب بھی عربی میں مختلف ہے۔مثلا: کتاب "زید"(زید کی کتاب)۔املا میں بھی اختلاف ہے۔

مثلا تائے مدورہ تائے طویلہ میں بدل جاتی ہے۔ مثلا صلاحیت (صلاحۃ)، قدرت(قدر) وغیرہ۔عربی الفاظ کے آخر کا ہمزہ اردو میں نہیں لکھا جاتا،مثلا: ابتدا، بقا،ثنا، جزا، املا وغیرہ۔تاخیر،تاکید، مامون، مانوس، مامور وغیرہ میں ہمزہ ظاہر نہیں کیا جاتا۔تاہم ترکیب میں ہمزہ مستعمل ہے مثلا ارتقائے حیات، دعائے خیر وغیرہ۔البتہ ذائقہ، لائق، شائق جیسے الفاظ کا املا اردو عربی میں یکساں ہے۔

عربی چونکہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔قرآن کریم ہر گھر میں پڑھا جاتا ہے اور ہر بچہ عربی سے مانوس ہے۔اس لیے عربی کا اثر ونفوذ ہماری زبان و ادب میں مستقل موجود ہے۔اردو میں مذہبی سرمایہ عربی و فارسی سے کسی طرح کم نہیں۔سکولوں میں عربی کا مضمون وسطانیہ میں شاملِ نصاب ہے۔دینی مدارس عربی زبان کی ترویج واشاعت کے لیے مسلسل سرگرمِ عمل ہیں۔کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر عربی زبان وادب کے شعبے موجود ہیں۔

پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد عرب ممالک میں روزگار کی خاطر مقیم ہے۔حج اور عمرہ کے زائرین میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔یہ لوگ براہِ راست عربی زبان وثقافت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔سائنسی لحاظ سے نہ سہی ،مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے عربی زبان کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔

دوسری طرف عرب ممالک میں برِصغیر کے باشندوں سے میل جول کی وجہ سے عرب

عوام کی عام بول چال میں اردو کے کئی الفاظ سننے کو ملتے ہیں بلکہ اہلِ عرب اردو کے چھوٹے موٹے جملے بھی روانی سے بولتے ہیں۔محسوس ہوتا ہے مستقبل میں بہت سے خالص اردو الفاظ عربی میں دخیل الفاظ کی صورت اختیار کر لیں گے۔

عربی اور اردو کے لسانی روابط پر کتابیں بھی لکھی گئیں اور تحقیقی مقالات بھی؛ تاہم ابھی بہت سے گوشے تحقیق طلب ہیں۔استفادے کے لیے ڈاکٹر احسان الحق (۲) اور ڈاکٹر رضوانہ معین (۳) کی تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ب۔اردو اور فارسی:

اردو کو فارسی کی دخترِ زیبا کہا جاتا ہے۔اردو اِس وقت ایک مکمل زبان کے مقام پر فائز ہوئی، جب عربی، فارسی اور قدرے ترکی الفاظ باقاعدہ اس کا حصہ بنے۔اسی آمیزش اور رنگِ خاص کی بنا پر اسے ریختہ اور بعد میں اردو کا نام دیا گیا۔اردو نے فارسی پر یوں اثرات مرتب کیے جیسے فرانسیسی نے انگریزی پر اور عربی نے فارسی پر۔مولانا محمد حسین آزاد کے بقول:

> اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اگا، فارسی ہندوستان کی سرکاری، تہذیبی اور علمی زبان رہی ہے۔اس لیے اس نے برصغیر کی تہذیب وثقافت اور یہاں کی تمام زبانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔عربی کا بھی کثیر سرمایہ فارسی کے ذریعے اردو میں منتقل ہوا۔(۴)

اگر ہم تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پندرھویں صدی سے بیسویں صدی تک فارسی نے اردو کی آبیاری کر کے اسے ایک متمول قد آور زبان بنا دیا۔فارسی لہجوں کے الفاظ کی ایک کثیر تعداد جو ایرانی فارسی میں شاذ ہی ملتی ہے؛ اپنی اصلی یا خفیف ترمیمی حالت کے ساتھ اردو میں محفوظ ہو

گئی ہے۔مثلاً لہجہ بخارائی سے حویلی،الاو،ازار بند،سموسہ(اسما)،بے مزہ،تماشبین،قرض خواہ،سوداگر،فدائی(صفات)،پسند کرنا،تیار کرنا،یاد رکھنا،درکار ہونا(مصادر)۔اس سے اہل خانہ،بے جا،کوفتہ(اسما)،بدزبانی کرنا،یاد کرنا،جلا دینا،داغ دیکھنا(مصادر)۔لہجہ کرمانی سے نیفا،پرسا،دیگچہ،بھورا(اسما)،گلہ کرنا،ازبر کرنا،پتہ پانی ہونا(مصادر)،فارسی عامیانہ افغانستان سے اردلی،تپاک،درزی،ریگ مار(اسما) وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی لکھتے ہیں:

اردو ذخیرہ الفاظ کا تقریباً ۶۰ فی صد حصہ فارسی ہے۔اس میں فارسی اور اس کے ذریعے آنے والے عربی و فارسی کے دخیل الفاظ بھی ہیں۔۔۔الفاظ کے اخذ وقبول کا معاملہ زیادہ تر اسما وصفات تک محدود رہتا ہے لیکن اردو نے فارسی اسما وصفات کے ساتھ ساتھ حروف وقیود(متعلقات فعل) بھی لے لیے ہیں۔لسانی تاریخ میں اخذ وقبول کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں(۵)۔

اردو نے تحریر کے لیے فارسی کے رسم الخط "نستعلیق" کو اپنایا جو عروس الخطوط ہونے کے ساتھ اپنے تمام پیش رو خطوط سے رواں، با کفایت اور آسان ہے۔یہ خصائص اس کی افادیت کو دو چند کر دیتے ہیں۔اردو میں لسانی اور ادبی سطح پر فارسی سے کس قدر استفادہ کیا؟ اس کے لیے لسانی سطح پر فرہنگ آصفیہ کا جائزہ ہی کافی ہے کہ اس کے کل ۵۴۰۰۹ الفاظ میں سے "۱۴۰۶" الفاظ فارسی الاصل ہیں(۶)۔

کاروبارِ حکومت،نظم ونسق،دفاع،خود ونوش،پھل اور میوہ جات،ملبوسات،آرائش و زیبائش،امراض اور ان کا علاج،اعضائے بدن،آداب والقاب،رسومات،عمارات،تعلیم و تدریس،معاشیات،معاشرت،فنونِ لطیفہ اور ادب و جمالیات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں

اردو نے فارسی سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات (۷) ،مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "اردو میں دخیل الفاظ "(۸)،ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اردو کی لسانی تشکیل (۹) میں فارسی کے اثرات کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔

فارسی اور اس کے توسط سے عربی الفاظ کا اردو کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس آمیزش و آویزش نے اردو میں وسعت اور قوت وشوکت پیدا کی۔ مثلاً آبرو، آرزو، آبشار، آغوش، آئین، ارمان، استوار، اشک، افسوس، بے باک، برہنہ، پیکر، پستی، پیوند، تنگ دستی، جامہ وغیرہ جیسے بے شمار ایسے اہم الفاظ موجود ہیں، جن کے بغیر اردو تحریر و گفتار کا تانا بانا بنا ہی نہیں جا سکتا۔ تراکیب میں آتش مزاج، آرزومند، آلہ کار، آتش بیان، آزاد منش، بادِ صبا، بدقماش، بلند پایہ، بیش بہا، بے بہا، پاسداری، پری وش، تشنہ لب، تن آسانی، تہی دست، چراغِ سحری، چشم و چراغ، دست درازی، دستِ راست، ریشہ دوانی، سیر چشم، سینہ فگار، لبِ بام، اردو ادب کا زیور اور جزو لازم ہیں۔

اردو صرف ونحو پر فارسی اثرات اگرچہ زیادہ نہیں تاہم اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ، حرفِ شرط، واوَ عاطفہ، حروفِ تمنا، نفی، تاکید وغیرہ نہ صرف فارسی سے لیے گئے بلکہ اسم فاعل، مفعول، ظرف، آلہ کی جمع وغیرہ کے قاعدے بھی فارسی وعربی سے لیے گئے ہیں۔ بے شمار مصادر کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ دونوں زبانوں میں افعال کے چھ صیغے ہیں۔ لفظ سازی میں اردو نے فارسی سے بہت استفادہ کیا۔ سابقوں لاحقوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ مقامی الفاظ کے ساتھ فارسی سابقوں لاحقوں سے ان گنت مرکبات بنائے گئے۔ مثلاً گاڑی

بان، پان دان، سمجھ دار، مرغی خانہ، پرچون فروش، دیوانہ پن، رہائش پذیر، کنبہ پروری، بے گھر، بے ہنگم، بے چین، ناسمجھ، ہم طبقہ، سرتوڑ وغیرہ۔ ان گنت فارسی تراکیب اور محاوروں کے لفظی ترجمے اردو میں رائج ہیں جنھیں بلاتکلف استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عرق عرق ہونا، دل خون ہونا، جان سے گزرنا، جامے سے باہر ہونا، حرف آنا، خوش آنا، گوش گزار کرنا وغیرہ۔

یک جان ودو قالب، یک سر و ہزار سودا، دروغ گو حافظہ نہ باشد، ہر چہ بادا باد، یک نہ شد دو شد، ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد، پیش از مرگ واویلا۔ خوی بدرا بہانہ بسیار، دیر آید درست آید جیسے مقولے اردو میں رائج ہیں۔ ضرب الامثال دونوں صورتوں میں رائج ہیں۔ اول: وہ جن کا اصل متن فارسی میں ہے۔ مثلاً حکمِ حاکم مرگِ مفاجات، آب آمد تیمّم برخاست، گذشتہ را صلوآئندہ را احتیاط، اول خویش بعد درویش، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، باادب بانصیب بے ادب بے نصیب، مالِ مفت دلِ بے رحم، من آنم کہ من دانم، من ترا قاضی بگویم تو مرا حاجی بگو، ہمتِ مرداں مددِ خدا، چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک؛ حتیٰ کہ فارسی نثر ونظم کے بعض مصرعے اور جملے اردو میں ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً: آفتاب آمد دلیل آفتاب، ہنوز دلی دور است، تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ دوم: ترجمے کی صورت میں مثلاً بیکار سے بیگار بھلی، دور کے ڈھول سہانے، پانچوں انگلیاں برابر نہیں، چراغ تلے اندھیرا، نیکی کر دریا میں ڈال، رسی جل گئی پر بل نہ گیا، احمد کی پگڑی محمود کے سر وغیرہ۔

ادبی لحاظ سے فارسی کے اردو پر بہت احسانات ہیں۔ فارسی میں ادب کی طویل روایت اور عظیم الشان ذخیرہ تھا اور اردو ادبا و شعرا نے اس خزینے سے بھرپور استفادہ کیا۔ فارسی کی عظیم روایت نے اردو کو کئی نئی اصناف سے متعارف کرایا اور اردو نثر و نظم نے اسالیب

ومضامین کے ہر پہلو سے استفادہ کیا۔اس سے کم سن اردو زبان کو نئی جہت ملی اور دائرہ وسیع ہوا۔نثر میں داستانیں، قصے کہانیاں، تاریخ نویسی، تذکرہ نویسی، رقعات نویسی، کتابوں کے مقدمے، پیش لفظ ،تقریظیں ،مکتوب نگاری، سرکاری اور عدالتی تحریریں وغیرہ جیسی اصناف فارسی سے مستعار ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری سے بے حد متاثر ہے۔دراصل اردو شاعری کا آغاز ہی فارسی شاعری کے ماحول میں ہوا۔اردو کے اکثر ابتدائی شاعر فارسی کے بھی شاعر تھے۔اس لیے لفظی اور معنوی دونوں سطحوں پر اردو نے فارسی کا اتباع کیا۔شکل وہیت اور بحر وقافیہ کی اس قدر پابندی کی گئی کہ اردو شاعری کو فارسی شاعری کا وجودِ ظلی کہا گیا۔تمام شعری اصناف قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مسدس، مسمط ،مستزاد، شہرِ آشوب وغیرہ فارسی سے لیں بلکہ ان تمام تمام اصناف ہیں اردو شعرا نے فارسی شعرا کی پیروی کی۔

فارسی شاعری سے سارا عروض اردو میں منتقل ہوا اور اس کی تمام بحریں برتی گئیں۔علمِ بیان وبدیع کے تمام اسالیب فارسی سے مستعار ہیں۔مضامین ،طرزِ بیاں، تلمیحات ،محاورات اور تمثیلات فارسی سے لی گئیں۔اردو تنقید میں وہی پیمانے استعمال کیے گئے جو فارسی میں تھے۔اصلاحِ زبان میں دیسی الفاظ کی جگہ عربی وفارسی کے فصیح وبلیغ الفاظ لائے گئے۔فارسی شاعری کی اس قدر تقلید ہوئی کہ ایرانی جغرافیہ، تاریخی تلمیحات حتیٰ کہ فارسی زبان کا لب ولہجہ بھی اردو میں داخل ہوا۔بعض مقامی اور دیسی الفاظ کو عربی وفارسی کا چولہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔

آریائی خاندان سے تعلق کی بنا پر فارسی اور اردو میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے؛ تاہم

دونوں میں اختلافات بھی ہیں۔مثلاً فارسی میں اردو کی معکوسی اور ہائیہ آوازیں نہیں۔

بنیادی تینوں حرکات(زیر، زبر، پیش) میں تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر زبر کے بجائے پیش: شعل، مدت، مسرت، معاش، وسعت وغیرہ؛ زبر کی بجائے زیر: عِجز، عِصمت، عِلاقہ، غِذا، خِیانت، نِکہت، کِنارہ، درِندہ؛ پیش کے بجائے زبر: فرخندہ، مزدور، گواہ وغیرہ۔ زیر کے بجائے زبر مثلاً درخت، فریاد وغیرہ۔

فتحہ خفیف، کسرہ خفیف، اور ضمہ حفیف اردو لہجے کی امتیازی خاصیت ہے۔ مثلاً محبوب، احترام، محترم۔ جدید فارسی میں واوٗ مجہول، اور یائے مجہول کے بجائے واوٗ معروف اور یائے معروف مستعمل ہیں، لیکن اردو میں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں۔ جدید فارسی میں نون غنہ کا رواج نہیں رہا لیکن اردو میں اکثر فارسی کلمات کا تلفظ اخفائے نون (نون غنہ) سے کیا جاتا ہے۔

جدید فارسی میں ہمزہ کا وجود نہیں۔ فارسی میں مستعمل ہمزہ،"ی " کا متبادل ہے مثلاً آرائش، غائب، قائل کے بجائے بالترتیب آرایش، غایب، قایل لکھا جاتا ہے۔ مشدد "ی " کو بھی دوبار لکھا جاتا ہے، مثلاً تغیر اور تعین کے بجائے تغییر اور تعیین۔

فارسی الفاظ کے معنی میں بھی اردو نے تصرف کیا ہے۔ مثلاً اندیشہ، چشمہ، مرغ، پاداش، بزرگ؛ بالترتیب خیال، مبدا، پرندہ، نیکی کی جزا، محترم؛ کے بجائے ڈر، عینک، مرغا، برائی کی سزا، بوڑھا کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اردو میں بہت سے مفرد الفاظ رائج ہیں جو عربی و فارسی سے اخذ کیے گیے ہیں۔ لیکن ان زبانوں میں اردو ساخت کے انداز میں استعمال نہیں ہوتے مثلاً شکریہ، صدی، عدالت، پیشگی، قوالی، رہائش وغیرہ۔ کہیں تارید و اضافہ سے نئے الفاظ بنالیے گئے ہیں مثلاً اب سے

ابا، چرغ سے چرخا،مرغ سے مرغا وغیرہ۔

اسی طرح عربی وفارسی کے اشتراک سے بہت سی ایسی تراکیب وضع کی گئی ہیں، جوان زبانوں میں نہیں پائی جاتیں ۔مثلا آمد آمد، بے روزگار، اداکار، اسمِ گرامی، باغ وبہار، خط کتابت،خودداری،فوج داری،تخریب کاری،خوش فہمی، دسترخوان،خون خرابہ،سرتاج،سبق آموز، غیر حاضری، دیدہ زیب وغیرہ۔ بہت سی تراکیب میں فارسی کے ساتھ اردو الفاظ کا پیوند لگایا گیا ہے اور وہ اردو زبان وادب کا جزو لاینفک ہیں مثلا دیوانہ پن، دل لگی، رہائش پذیر، چوکی دار، بے چین، بدچلن وغیرہ۔

قواعد میں بھی کچھ اختلافات ہیں۔مثلا فارسی میں تذکیروتانیث کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کے صیغے مذکرومونث دونوں کے یکساں طور پر مستعمل ہیں جبکہ اردو میں بے جان اشیا کے لیے بھی تذکیروتانیث کا امتیاز برتا جاتا ہے۔واحد سے جمع بنانے کا قاعدہ دونوں زبانوں میں مختلف ہے۔مستعار فارسی الفاظ کی جمع بناتے وقت اردو قواعد کی پابندی کی گئی۔مثلا درختوں، مردوں،شخصوں، دکانوں وغیرہ۔

فارسی مرکبات اضافی میں مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں آتا ہے۔مثلا اربابِ فن، بزمِ سخن، لائقِ تحسین، میرمجلس، قابلِ داد وغیرہ۔ جبکہ اردو میں ترتیب الٹ ہے۔مثلا مجلس کا امیر،شاعری کی محفل۔فارسی مرکب توصیفی میں موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے مثلا آبِ رواں، ذہنِ رسا،منظرِ عام،لیکن اردو میں بہتا پانی،نکتہ چین ذہن، عام منظر مستعمل ہے۔اگرچہ فارسی میں بھی مرکب توصیفی کی دوسری حالت اردو سے مشابہ ہے۔مثلا نیک بخت، بلند پرواز، عالی ظرف، نازک مزاج، بلند ہمت وغیرہ۔

ایک زمانے میں فارسی ایران،افغانستان اور وسط ایشیا کی طرح برصغیر میں بھی تعلیم

،تہذیب اوراقتدار کی زبان تھی؛ جس نے اردوسمیت یہاں کی دیگر زبانوں اور مقامی بولیوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ پاکستان کی تمام بڑی زبانوں مثلاً پنجابی،سندھی،پشتو اور بلوچی میں فارسی کا معتد بہ ذخیرہ الفاظ موجود ہے(۱۰)۔

فارسی اوراردو کے لسانی روابط پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ڈاکٹر محمد عطااللہ خان (۱۱) اور ڈاکٹر عصمت جاوید(۱۲) کی تحقیقی کتب بہت مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

برِصغیر کی زبان وادب پر فارسی کے اثرات اور غلبے کی بڑی وجہ حکمران طبقے کا فارسی دان ہونا تھا۔تاہم برصغیر میں انگریزی اقتدار کے بعد فارسی اثر ونفوذ کی ماقبل کیفیت نہ رہی مگر آج بھی اردو پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔بوجوہ نئی نسل بتدریج فارسی سے بےگانہ ہوتی گئی۔مقامِ افسوس ہے کہ اب جامعات کے اردو اساتذہ کی قابلِ ذکر تعداد بھی فارسی سے نابلد ہے۔ ماضی قریب میں سکولوں میں وسطانیہ میں فارسی کا مضمون لازمی تھا،جس سے طلبہ کو فارسی سے ابتدائی شد بد ہو جاتی تھی،لیکن جنرل ضیاالحق کے زمانے میں فارسی کے بجائے عربی کو وسطانیہ میں لازمی کر دیا گیا؛ جس سے مطلوبہ نتائج بھی حاصل نہ ہوئے اور ہم فارسی تدریس سے بھی محروم ہو گئے۔اگر چہ کالج کی سطح پر فارسی کا مضمون شاملِ نصاب ہے،لیکن مارکیٹ میں کھپت نہ ہونے کی وجہ سے رغبت نہیں رہی۔دینی مدارس میں بھی فارسی تدریس کا رجحان نہیں رہا،صرف شیعہ مکاتبِ فکر کے مدارس میں فارسی پڑھائی جاتی ہے۔رسمی تعلیم میں جامعات کے فارسی شعبہ جات ہی فارسی کی بقا اور ترویج کی آخری امید ہیں؛البتہ بڑے شہروں میں "خانہ فرہنگ ایران " کی شاخیں فارسی زبان کی ترویج کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔

فارسی اور اردو کے صوتی نظام میں حد درجہ مناسبت ہے۔ فارسی کے تمام حروف اور آوازیں اردو میں موجود ہیں۔ دونوں زبانوں کے تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور ادبی روابط کی بنا پر اہلِ اردو بہت آسانی سے فارسی زبان سیکھ سکتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایران و پاکستان کے درمیان معاشی اور تجارتی روابط کو مزید مستحکم کیا جائے۔ ہمسایہ ممالک ہونے کی وجہ سے اس کے وسیع امکانات ہیں۔ معاشی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے نہ صرف فارسی اردو میں قربت بڑھے گی بلکہ دونوں برادر اسلامی ممالک کے درمیان محبت و اخوت کا رشتہ بھی مضبوط ہوگا۔

ج۔ اردو اور ترکی:

اردو میں ترکی کی الفاظ کی تعداد نسبتاً کم ہے تاہم، عربی و فارسی کے بعد جس بیرونی زبان کے اردو پر سب سے زیادہ اثرات مرتسم ہوئے وہ ترکی ہے۔ خود لفظ اردو ترکی زبان سے ماخوذ ہے، جس کا معنی فوج یا لشکر گاہ ہے۔ ترکی میں عسکری تربیت کی اہمیت کے پیشِ نظر ہر شہر میں اردو بازار یا اردوایو (ایو بمعنی گھر) کثرت سے ملتے ہیں۔ ترکی میں لوگ عمومی طور پر اردو زبان کو اردی (غالباً فوج سے ممتاز کرنے کے لیے) کہتے ہیں۔ اگرچہ برصغیر کے اکثر حکمران ترک النسل تھے۔ جن کی مادری زبان ترکی تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اردو پر ترکی زبان کے اثرات زیادہ نہ پڑ سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فارسی ہی دربار اور علم وحکمت کی زبان تھی۔ ان حکمرانوں نے دانستہ طور پر ترکی کو مسلط کرنے کی کوشش بھی نہیں اور ایک علمی لحاظ سے ترقی یافتہ اور مہذب زبان پر اپنی مادری زبان کو ترجیح نہیں دی۔ یہ بات ان حکمرانوں کے غیر متعصّبانہ رویے اور وسعت نظری کی غماز ہے۔

اردو میں ترکی الفاظ زیادہ تر فوج واسلحہ، ملبوسات، خوردونوش اور سماجی القاب سے متعلق ہیں مثلاً توپ، ایلچی، چاقو، یلغار، یورش، سپاہ، نقارہ، تمغہ، قاب، چمچہ، باورچی، قورمہ، قیمہ، قاش، خاتون، خان، خانم، بیگ، بیگم، بی بی، آغا، بابا، سوغات، کمک، سراغ، وغیرہ(۱۳) ۔

استنبول یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات کے پروفیسر ڈاکٹر درمش بلگر(Durmus Bulgur) کے مطابق "اردو زبان میں ترکی کے لگ بھگ تین ہزار الفاظ اپنے اصل معانی کے ساتھ شامل ہیں (۱۴)۔"

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے "اردو اور ترکی کے مشترک الفاظ " کے عنوان سے پردل خٹک صاحب کی کتاب شائع کی ہے۔ جس میں ۸۰۶۲ الفاظ ہیں۔ اگر چہ اردو اور ترکی میں کم وبیش تین ہزار الفاظ مشترک ہیں تاہم بہت سے الفاظ میں صوتی ومعنوی اختلاف بھی ہے مثلاً حضور: سکون، دائرہ؛ دفتر، وقت: توجہ، کار: برف، ظرف: لفافہ، محبت: مصیبت، واہ: بہت برا، وغیرہ۔

پردل خٹک نے اپنی تصنیف (۱۵) اور ڈاکٹر انوار احمد (۱۶) اور سلیمان زارع (۱۷)، Mara اور Isabel Maldonado Garca

Mustafa Yapici (۱۸) نے اپنے مضمون میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے بات کی ہے ۔ترکی کی اکتسابی کتب میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار حسین کی تصنیف نہایت مفید ہے (۱۹) ۔اردو ترکی لسانی روابط کے اعتبار سے ڈاکٹر امتیاز احمد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہایت اہم دستاویز ہے (۲۰)۔اردو ترکی لغات میں "ترکی اردو لغت "از محمد

صابر (۲۱)،''ترکی اردو لغت "مرتبہ ظفر حسن ایبک (۲۲)''اردو ترکی لغت مرتبہ عابدہ حنیف (۲۳)،''اردو ترکی لغت مرتبہ احمد بختیار اشرف، ڈاکٹر جلال صوئیدان (۲۴)'' اور Trke Urdu Urdu Trke از احمد بیہتیات، جلال صوئیدان اہم ہیں (۲۵)۔

جیسا کہ سطورِ بالا سے واضح ہے کہ ترکی نے اردو پر عربی اور فارسی جیسے گہرے اثرات مرتب نہیں کیے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی ترکی سے قلبی اور روحانی نسبت کمزور ہوگئی۔ مصطفیٰ کمال پاشی کے دور میں ترکی زبان کا عربی رسم الخط ختم کر کے رومن رسم الخط رائج کر دیا گیا، جس نے دونوں زبانوں میں فاصلوں کو مزید بڑھا دیا۔ حال میں ترکی اور پاکستان کے تعلقات میں قربت آئی ہے، جس کی وجہ سے پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد سیر و سیاحت اور معاشی سرگرمیوں کے لیے ترکی کا رخ کر رہی ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے ترک طلبہ کی ایک قلیل تعداد گاہے گاہے اردو سیکھنے پاکستان (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) آتی ہے؛ تاہم ان وفود کا دورانیہ بھی بہت کم ہے اور تسلسل اور باقاعدگی بھی نہیں۔ حال میں "یونس ایمرے انسٹیوٹ "لاہور، اسلام آباد اور پشاور میں اپنے مراکز قائم ر رہا ہے، جہاں ترکی زبان کی تدریس ہو گی۔ اگرچہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں ترکی بان سکھائی جاتی ہے، لیکن اس کا دائرہ محدود ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلے کو مزید وسعت اور استحکام دیا جائے۔ زبان کا یہ ربط و تعلق مستقبل میں CPEC جیسے منصوبے کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ سیداحمد دہلوی،مقدمہ فرہنگِ آصفیہ(نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷)

۲۔ احسان الحق،ڈاکٹر،اردوعربی کے لسانی رشتے(کراچی:قرطاس،۲۰۰۵)

۳۔ رضوانہ معین،ڈاکٹر،اردوپرعربی کے لسانی اثرات(حیدرآباد آندھراپردیش:۱۹۹۸)

۴۔ محمد حسین آزاد،آبِ حیات(لاہور:خزینہ علم وادب،۲۰۰۱)ص۸۶

۵۔ محمد صدیق خان شبلی،ڈاکٹر،اردو کی تشکیل میں فارسی کا حصہ(اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۴)ص۲۳۔۲۴

۶۔ سیداحمد دہلوی،مقدمہ فرہنگِ آصفیہ(نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷)

۷۔ محمد حسین آزاد،آبِ حیات،(لاہور: خزینہ علم وادب،۲۰۰۱)ص۳۳۔۳۴

۸۔ مولوی عبدالحق،اردو میں دخیل الفاظ(کراچی:رسالہ اردو،جولائی۱۹۴۹)

۹۔ خلیل احمد بیگ،ڈاکٹر،اردو کی لسانی تشکیل،(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۰) ص۱۷۹۔۱۸۰

۱۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:پاکستان کی علاقائی زبانوں پرفارسی کا اثر(کراچی:ادارہ مطبوعات پاکستان)

۱۱۔ محمد عطااللہ خان،ڈاکٹر،اردواورفارسی کے لسانی روابط(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۷)

۱۲۔ عصمت جاوید،ڈاکٹر،اردو پر فارسی کے لسانی اثرات(تصرف کے آئینے میں)(اورنگ آباد)مہاراشٹر(:۱۹۸۷)

۱۳۔ مرزا خلیل بیگ، ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاوس ۱۹۹۰،)ص ۱۸۱

۱۴۔ ایس۔ایم معین قریشی،ڈاکٹر،ترکی میں اردو،قومی زبان(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،نومبر ۲۰۰۹)ص ۵۷

۱۵۔ پردل خٹک،اردو اور ترکی کے مشترک الفاظ(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷) ص ۵

۱۶۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اردو ترکی مشترک الفاظ کے امتیازات(اسلام آباد: اخبار اردو،مقتدرہ قومی زبان،مئی ۲۰۰۰)

۱۷۔ سلیمان زارع،اردو اور ترکی زبان کا تقابلی مطالعہ(نئی دہلی:اردو ریسرچ جنرل،شمارہ ۱۱،جولائی۔ستمبر ۲۰۱۷)ص ۶۵۔۷۴

۱۸۔ Common Vocabulary in Urdu and Turkish Language:A Case of Historical Onomasiology (http://pu.edu.pk/images/journal/studies/PDF-FILES/Artical-10_v15_no1.pdf)

۱۹۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،اوزون زینب،ترکی کے ذریے اردو سیکھیے(اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۰)

Common Vocabulary in Urdu and Turkish Language:A Case of Historical Onomasiology

۲۰۔ امتیاز احمد، ترکی اور اردو کے لسانی روابط (مقالہ پی۔ایچ۔ڈی) (پشاور: قرطبہ یونیورسٹی)

۲۱۔ محمد صابر، ترکی اردو لغت (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۶۸)

۲۲۔ ظفر حسن ایبک، ترکی اردو لغت (اسلام آباد: وزارت تعلیم، ۱۹۸۹)

۲۳۔ اردو ترکی لغت مرتبہ عابدہ حنیف (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴)

۲۴۔ اردو ترکی لغت مرتبہ احمد بختیار اشرف، ڈاکٹر جلال صوئیدان (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸)

ASRAF, Ahmet Bahtiyar; SOYDAN Celal, Urdu Trke Trke Urdu Szlk(Ankara:Trk Dil Kurumu, 2012)

باب سوم

اردو زبان کے عہد بہ عہد مختلف ناموں کا جائزہ

(ہندوی، گجری، دکنی، ریختہ، اردو)

فہرست مندرجات

الف۔ ہندی یا ہندوی

ب۔ ریختہ

ج۔ ہندوستانی

د۔ اردو

ہ۔ دیگر مختلف نام

اردو زبان کے عہد بہ عہد مختلف ناموں کا جائزہ

(ہندوی، گجری، دکنی، ریختہ، اردو)

اردو برِصغیر پاک و ہند کی سب سے اہم زبان ہے، جو پورے جنوبی ایشیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو ایک جدید زبان ہے، لیکن اس نے اپنی ملنسار طبیعت اور امتزاجی مزاج کی بدولت بہت جلد ترقی کی اور پورے برِصغیر کی رابطہ زبان (Lingua Franca) بن گئی۔

تشکیل وارتقا کے مختلف ادوار میں یہ زبان مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔ مختلف ادوار میں اردو کے مروجہ ناموں کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری (اردوئے قدیم) اور سید سلیمان ندوی (نقوشِ سلیمانی) نے کیا ہے۔ اس ذیل میں حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اردو)، ڈاکٹر شوکت سبزواری (داستانِ زبانِ اردو)، ڈاکٹر سہیل بخاری (اردو کا روپ) اور ڈاکٹر گیان چند (لسانی مطالعے) نے بھی تحقیقی بحث کی ہے۔ ان ناموں کے مطالعے سے ہم پر اردو زبان کی تاریخ کا منظر واضح ہونے لگتا ہے، کیونکہ یہ نام اردو کے ارتقا کی ایک داستان بھی ہیں اور اس کی تہذیب وثقافت کے ترجمان بھی۔ شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا اور یہ نام اسی ترتیب سے استعمال میں آئے، جس ترتیب سے میں نے انھیں درج کیا ہے''۔(۱)

آیئے ان ناموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

الف۔ ہندی یا ہندوی

تاریخی شواہد اور لسانی تحقیقات کے مطابق اردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی ہے۔

تزکِ بابری میں ایک راجا کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کشمیری اور ہندی دونوں زبانیں جانتا ہے۔

امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) غرۃ الکمال کے دیباچے میں اپنے اردو کلام کو ہندوی کہتے ہیں۔(۲)

امیر خسرو نے اپنے پیشرو مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ) کے عربی اور فارسی دیوان کے ساتھ اس کے ہندوی دیوان کا ذکر بھی کیا ہے۔(۳)

قدیم تذکرہ نویس محمد عوفی نے لباب الالباب میں مسعود سعد سلمان لاہوری کے بارے میں لکھا کہ انھوں نے ایک دیوان ہندی میں ترتیب دیا تھا۔(۴)

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ''اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے، جو حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کے رسالہ خوش نما میں ملتی ہے''۔(۵)

صوفیائے کرام کے قدیم ملفوظات، قدیم ادبی لغات اور تصنیفات سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی (م۷۵۷ھء)، شرف الدین یحییٰ منیری(م۱۳۷۰ء)، اشرف جہانگیر سمنانی (م۱۴۰۵ء)، شاہ میراں جی شمس العشاق(م۱۴۹۶ء) اور شاہ برہان الدین جانم (م۱۵۸۲ء) کے ہاں یہ نام ملتا ہے۔اسی

طرح جعفر زٹلی (م ۱۷۱۳ء)، عبدل بیجاپوری کی کتاب ابراہیم نامہ (۱۶۰۳ء)، ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) اور فضلی کی دہ مجلس (۱۷۳۲ء) وغیرہ میں اردو کا نام ہندی یا ہندوی ہے۔

قدیم لغت نویسوں نے چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی کے نصف تک اس زبان کو ہندی یا ہندوی ہی لکھا ہے۔ چنانچہ قاضی خاں بدر اور سراج الدین علی خاں آرزو تک سبھی لغت نویسوں نے اردو کو ہندی یا ہندوی ہی لکھا ہے۔

میر اثر (م ۱۷۹۴ء) نے اپنی مثنوی خواب و خیال کی ابتدا میں اپنی زبان کو 'ہندوی' قرار دیا ہے:

فارسی سو ہیں، ہندوی سو ہیں
باقی اشعار مثنوی سو ہیں(۶)

ب۔ ریختہ

ہندوی کے بعد اردو کا دوسرا مقبول نام ریختہ ہے۔ ہندی یا ہندوی کے بعد اردو کے لیے ریختہ کا نام اختیار کیا گیا اور پھر اردو زبان کا نام ہو گیا۔ (۷)

ریختہ فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کا مصدر ریختن ہے۔ اس کے معنی ہیں: بنانا، ایجاد کرنا، نئے سانچے میں ڈھالنا۔ ریختہ ایسے کلام کو کہتے ہیں، جو کئی زبانوں کا مرکب ہو۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کسی چیز کو قالب میں ڈھالنا اور موزوں کرنا، پریشان و گری پڑی چیز وغیرہ۔

ریختہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف ماہرینِ زبان نے اظہارِ خیال کیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''اس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے، جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی،؛ پریشاں چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشاں جمع ہیں، اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں''۔(۸)

منشی درگا پرشاد نادر خزینۃ العلوم میں لکھتے ہیں:

''ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں۔ پس جو زبان اپنی اصلیت سے گر جائے، اس کو زبانِ ریختہ بولتے ہیں۔ چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے، اسے زبانِ ریختۂ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح [اسے] زبانِ ریختۂ ہندی کو زبانِ اُردو سمجھتے ہیں''۔(۹)

لفظ ریختہ موسیقی کی اصطلاح کے طور پر بھی مستعمل رہا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق: ریختہ کا لفظ موسیقی کی اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے امیر خسرو نے استعمال کیا۔ انھوں نے لکھا ہے:

''آخری معنی کے اثرات میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنی پیدا کر لیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز تیار کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں، اس کو

ریختہ کہتے ہیں''۔(۱۰)

یعنی مقامی راگوں اور فارسی کو ملا کر ہندوستانی موسیقی میں، جو اختراع وجود میں آئی، اس کو ریختہ کہا گیا۔ کچھ عرصے بعد ریختہ کا اطلاق ایسے کلامِ منظوم پر ہونے لگا، جس میں ہندی اور فارسی کے اشعار متحد ہوں۔(۱۱)

زبان کے لیے 'ریختہ' شہنشاہِ اکبر کے عہد میں غالبًا پہلی بار استعمال ہوا، مگر یہ استعمال صرف شاعری تک محدود تھا۔ بولی جانے والی زبان اور نثری کاوشوں کے لیے ہندی کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا۔ اس کی وجہ بھی غالبًا موسیقی تھی، کیونکہ بعض قدیم غزلوں میں فارسی اور ہندوی کا پرلطف امتزاج ملتا ہے۔ مثال کے طور پر امیر خسرو کی غزل کے چند اشعار:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دو رائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

لغوی معنی سے قطع نظر اگر ہم ریختہ کو ایک لسانی اصطلاح کے طور پر دیکھیں تو یہ لفظ اُردو زبان کے لیے نسبتاً کم اور شاعری کے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے فارسی آمیز اردو غزل کہی، جسے ریختہ کا نام دیا گیا۔

حافظ محمود شیرانی کے بقول:

''ریختہ سے ہماری مراد ایسا کلامِ منظوم ہے جس میں ملمع کی طرح فارسی اور ہندی کے الفاظ یا فقرے متحد ہوکر کسی خاص مقصد یا مفہوم کو ادا کریں''۔(۱۲)

ریختہ کی منظوم فنی حیثیت کے بارے میں میر تقی میر نے تذکرہ نکاتِ الشعرا ء میں تفصیل سے وضاحت کی ہے۔(۱۳)

ریختہ گوئی کے حوالے سے سب سے نمایاں نام حضرت امیر خسرو کا ہے، جن کی طرف بے شمار دوسخنے، انملیاں، کہہ مکرنیاں، دوہے اور متعدد اشعار منسوب ہیں۔ امیر خسرو کے بعد سعدی کاکوروی یا سعدی اورنگ آبادی کا نام آتا ہے، جن کی مشہور غزل کا مقطع ہے:

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

علاوہ ازیں حضرت فرید الدین گنج شکر اور شیخ بہاؤالدین باجن کے ہاں ریختہ گوئی کی بہت خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

مصحفی تک ہندی اور ریختہ دونوں اردو شاعری کے لیے مستعمل رہے۔ مثال کے طور پر:

مصحفی فارسی کو طاق پر رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج
کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی(۱۴)

اگرچہ ریختہ کی اصطلاح ابتدا میں ایک مخصوص طرزِ شاعری کے لیے استعمال ہوئی، مگر بعد میں ریختہ کا لفظ اُردو شاعری کے لیے معروف ہوگیا۔ چنانچہ قدیم شعرا نے شاعری اور زبان کے لیے لفظ ریختہ کا استعمال کیا ہے۔ شاہ حاتم، قائم، میر، سودا، مصحفی، سوز، جرأت اور غالب تک کے ہاں یہ لفظ اُردو شاعری کے لیے استعمال ہوتا رہا:

ریختہ کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ولی اور سراج سے لے کر غالب کے عہد تک 'ریختہ' کا لفظ اردو شاعری کے لیے مقبول ہو چکا تھا: بقولِ ولی

ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے
سنے تب اس کوں جان و دل سوں حسانِ عجم آ کر(۱۵)

اس زمانے میں 'زبان' کے لیے عموماً ہندی اور ریختہ کا لفظ شاعری کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شمال میں ریختہ اور ہندی ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے یکساں مقبول تھے۔ یہ حالت اٹھارھویں صدی تک رہی۔ وسط انیسویں صدی سے زبان کے نام کی حیثیت سے ہندی کو ریختہ پر ترجیح دی جانے لگی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں بول چال کی زبان کو تقریباً ہمیشہ ہندی ہی کہا جاتا تھا، جبکہ اٹھارھویں صدی میں ریختہ کو بول چال کی زبان کے لیے بے تکلف استعمال کرتے تھے''۔(۱۶)

ج۔ ہندوستانی

اُردو کے ابتدائی عہد میں ہندوستان کی نسبت سے اسے ہندوستانی بھی کہا گیا۔ خصوصاً انگریزوں کے ہاں یہ لفظ زیادہ مقبول رہا۔ ڈاکٹر گریرسن، مسٹر یول (ULE) کے حوالے سے اس کے استعمال کی قدیم ترین تاریخ ۱۶۱۶ء بتاتے ہیں۔(۱۷)

مسلمانوں نے اس کا استعمال شاہ جہاں کے عہد سے شروع کیا۔
عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
ملاوجہی سب رس میں اردو کو زبانِ ہندوستان لکھتے ہیں۔
وجہی اپنے مشہور تمثیلی قصے کا عنوان یوں قائم کرتے ہیں: 'آغازِ داستان زبانِ ہندوستان'۔

زبان کے لیے لفظ 'ہندوستانی' کی قدیم ترین شہادت تزک بابری میں ملتی ہے۔ بابر نے لکھا ہے:

> ''میں نے اسے ((دولت خان لودھی کو) اپنے سامنے بٹھایا اور اس کو پکا یقین دلانے کے لیے ایک شخص کے ذریعے، جو ہندوستانی زبان جانتا تھا، ایک ایک جملے کا مطلب واضح کروایا''۔(۱۸)

بقولِ حافظ محمود شیرانی:

> ''اُردو زبان کے لیے لفظ ہندوستانی کی سب سے قدیم شہادت ابراہیم عادل شاہ کے دور میں فرشتہ کے ہاں ملتی ہے۔ ابوالفضل نے بھی آئینِ اکبری میں اُردو زبان کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے''۔(۱۹)

'لفظ ہندوستانی بطورِ زبان' کے سلسلے میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے، جو شواہد جمع کیے ہیں، ان کی رو سے:

> ''۱۔ یہ نام سب سے پہلے عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ کی دوسری جلد میں ملتا ہے۔ اس میں شاہ جہاں کے درباری گویے مغل خاں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: 'دریں عہدِ سعادت مہد سرآمد نغمہ سرایانِ ہندوستانی

زبان است'۔

۲۔ نواب صدر یا رجنگ بہادر کہتے ہیں:' سب سے پہلے پرتگیزیوں نے سترھویں صدی عیسوی میں ہماری زبان کا نام انڈوسٹان رکھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان مور کہلاتے تھے۔ اسی صدی میں زبان کو انڈوسٹانی بول جاتے تھے۔ مور بھی کہہ دیتے تھے۔ ۱۶۹۷ء میں ہندوستانی زبان (Hindostini Language) کا لفظ پایا جاتا ہے۔ ۱۷۲۶ء میں ایک مؤرخ لکھتا ہے : 'یہاں کی (ہندوستانی) زبان ہنڈوسٹانڈ (Hindostand) یا مورز ہے'۔

۳۔ گلکرسٹ نے اپنی ڈکشنری کا نام انگریزی ہندوستانی رکھا ہے۔

۴۔ میر امن باغ و بہار کے دیباچے میں کہتے ہیں:' جان گلکرسٹ صاحب نے فرمایا کہ قصے کو ایسی ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان؛ عورت مرد؛ لڑکے بالے؛ خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرؤ۔

۵۔ گارسین وتاسی بھی اسے ہندوستانی کہتا ہے۔

۶۔ گریرسن نے بھی اس بولی کو ہندوستانی کہا ہے''۔(۲۰)

ڈاکٹر سلیم اختر 'ہندوستانی' نام کے مزید شواہد پیش کرتے ہیں:

''گلکرسٹ ۱۷۹۶ء میں ہندوستانی گرائمر کلکتہ سے طبع کرا چکا تھا:

HINDOOSTANEE اُردو کے لیے ہندوستانی نام کے ضمن

میں مزید شواہد ہیں: کیپٹن جوزف ٹیلر کی مدون کردہ ڈکشنری، جب ۱۸۰۸ءعیسوی میں چھپی تو اُردو کو 'ہندوستانی' قرار دیا گیا۔ جان شیکسپیئر نے اپنی لغت کو HINDUSTANI AND ENGLISH کہا، جبکہ دیباچے میں اس نے اُردو کو ہر جگہ 'ہندوستانی' لکھا ہے۔ ڈاکٹر (HARRIS) بھی یہی لکھتا ہے۔

ملاحظہ ہوں اس کی یہ دو ڈکشنریاں:

1. DICTIONARY: ENGLISH AND HINDOSTANY MADRAS: 1970
2. AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF THE HINDUSTNY LANGUAGE AS SPOKEN IN THE CARNATIC: MADRAS: 1824

اسی طرح جان جوشوا کٹیلر کی قواعد (۱۷۱۵ء) اور شلز کی قواعد (۱۷۴۵ء) میں بھی اُردو کو 'ہندوستانی' ہی کہا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں انگریزوں نے اردو کو 'مورس' کا بھی نام دیا۔ سب سے پہلے مستشرق کول بروک نے اسے' مورس' (مسلمانوں کی زبان) کہا''۔(۲۱)

پھر اٹھارھویں صدی میں انگریزوں کے ہاں اس نام کا چلن رہا۔

د۔ اُردو

آخر میں اِس زبان نے 'اُردو' نام اختیار کیا اور یہی نام آج تک رائج ہے۔ محققین کی

اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ اُردو تر کی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: ' لشکر یا چھاؤنی'۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے تحقیقات کی بنا پر لکھا ہے کہ:

''یہ لفظ تر کی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے،۔یعنی: اود، اورد، اور دو اور اُردو جس کے معنی فرودگاہ، لشکر اور پڑاؤ، نیز لشکر و حصۂ لشکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ، بازار، لشکر، حرم گاہ، محل و محل برائے شاہی و قلعہ بھی ہوتا ہے''۔(۲۲)

ہندوستان میں سب سے پہلے اردو لفظ کا استعمال شہنشاہ بابر کی تـزکِ بـابری میں ملتا ہے۔ بقولِ حافظ محمود شیرانی:

''بابر اپنی ٹکسال کو بھی اردو کہتا تھا، جبکہ اکبر کی لشکری ٹکسال اردو ظفر قرین یا اردوئے ظفر قرین اور خال خال موقعوں پر اردو بھی کہلاتی تھی۔ اکبری عہدِ حکومت میں بھی اُردو لشکر اور اس کے متعلقات کے لیے استعمال ہوتا رہا''۔(۲۳)

چنانچہ شیرانی نے اردو علیہا، اردوئے معلیٰ، اردوئے لشکر، اردو حضرت، اردو ظفر ین، اردوئے عالی اور اردوئے بزرگ جیسی تراکیب گنوائی ہیں۔

لفظ 'اردو' اپنی مختلف صورتوں میں رائج ہو چکا تھا، مگر ابھی تک زبان کے معنی میں اس کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ جہانگیر کے وقت تک اس زبان کا نام ہندوی تھا۔ شاہ جہان (م۱۶۶۶ء) نے اپنے شہر کے لیے اردوئے معلیٰ کا نام تجویز کیا۔ میر امن باغ و بہار میں لکھتے ہیں:

''تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنایا۔ تب سے

شاہ جہان آباد مشہور ہوا (اگر چہ دہلی جدی ہے۔وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے)اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا''۔(۲۴)

بقولِ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

''شاہ جہاں نے سب سے پہلے اُردو زبان کے لیے اُردوئے معلیٰ کا نام پسند کیا۔اُردوئے معلیٰ ٹکسالی زبان تھی اور اس کے مقابلے میں دوسری علاقائی زبانوں کو معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا''۔(۲۵)

اُس وقت بھی شاعری کے لیے ریختہ کا لفظ ہی مروج تھا،لیکن اردوئے معلیٰ کی مخصوص اصطلاح وجود پذیر ہو چکی تھی۔بہرحال میر تقی میر (نکات الشعراء :۱۷۵۲ء)اور قائم (مخزن نکات :۱۷۵۷ء)نے اردوئے معلیٰ کو محاورہ کے مطابق ہی لکھا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

''ہماری زبان کے نام کے طور پر لفظ اردو کا استعمال اٹھارھویں صدی کے ربعِ آخر سے پہلے نہیں ملتا۔زبان کے نام کے طور پر اس لفظ (اردو) کی زندگی غالباً زبان اردو معلائے شاہ جہان آباد کی شکل میں شروع ہوئی اور اس سے مراد تھی: شاہ جہان آباد کے شہرِ معلیٰ رقلعۂ معلیٰ ردربارِ معلیٰ کی زبان''۔(۲۶)

اردو شعرا نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس زبان کو 'زبانِ اردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد' کہنا شروع کیا:

''اس کا حوالہ سب سے پہلے میر تقی میر کے ہاں نکات الشعراء (۱۷۵۲ء) میں ملتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زبان،'زبانِ اردوئے معلیٰ' اور پھر' اردوئے معلیٰ' کہلانے لگی۔ذکرِ میر میں'زبانِ اردوئے معلیٰ' اور قائم کی مخزنِ نکات

میں 'اردوئے معلیٰ' کا ذکر آتا ہے۔ 'زبانِ اردوئے معلیٰ' رفتہ رفتہ صرف 'زبانِ اردو' کہلانے لگی۔ یہ نام علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے گلزارِ ابراہیم (۱۱۹۸ء) میں ملتا ہے۔ میر امن نے باغ و بہار کے مقدمے میں اردو کے لیے 'زبانِ اردو' کے بجائے 'اردو کی زبان' کا نام اختیار کیا: 'حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے''۔(۲۷)

کچھ محققین اُردو کو ترکی کا لفظ تسلیم نہیں کرتے، مثلاً: علامہ قاضی نے لفظ اردو کے بارے میں اپنے تحقیقاتی مواد کی بنا پر لفظ اردو کو ترکی زبان کا لفظ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ رقم طراز ہیں:

''عام سندھی بول چال میں 'اردو' ڈھیر یا اشیا کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے یہ معنی عربوں کے سندھ میں وارد ہونے سے تین ہزار برس پہلے سے رائج ہیں۔ تاہم لفظ ارد urd سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا...... قدیم ناردک (Nordic) دیو مالا میں لفظ ارد urd یا اُرتھ urth ایک دیوی کا نام ہے، جو خود تقدیر ہے۔...... پس ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ 'ارد' آریائی زبان کے قدیم ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آتا ہے۔ یہ آریائی تمدن کی ابتدا اور اسی خاصیت کا مظہر ہے، یعنی انسانی معاشرت کا یہی وہ لفظ ہے، جو لفظ 'ارد' کا ماخذ ہے، جس کے معنی ایسے مجمع کی زبان ہے کہ جس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوں''۔(۲۸)

اس حوالے سے ایک اور نقطۂ نظر بھی ہے کہ اردو دراصل لاطینی الاصل ہے۔ یہ HORDE سے بنا ہے، جس کے معنی: گروہ، مجمع، لشکر اور بعض اوقات خانہ بدوش بھی

ہیں۔ترکی میں یہ لفظ بعد میں پہنچا۔حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی تالیف اردوئے قدیم میں اس لفظ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کے فرد گاہوں اور لشکر گاہوں کو'اردو' کہا کرتے تھے۔یہاں تک کہ ان کا مستقرِ حکومت بھی اردو کہلاتا تھا اور 'قراقرم' کا قدیم نام' اردو بالیغ' تھا''۔(۲۹)

بہرحال مسند حوالوں سے ثابت ہے کہ اردو ترکی الاصل لفظ ہے۔

سلجوق یونیورسٹی قونیہ (ترکی) کے صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر اریکان ترکمان کے بقول:

''بموجب ۷۳۴ میلادی کل تگیں بادشاہ نے ایک ستون کندہ کرایا، جس کی عبارت ترکی زبان کے قدیم ترین نمونوں میں سمجھی جاتی ہے۔اس میں لفظ اُردو (URDU) مرکزِ حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی کے معنی میں کندہ ملتا ہے''۔(۳۰)

ہندوستان میں اُردو کا لفظ سب سے پہلے تزکِ بابری میں ملتا ہے۔(۳۱)

ڈاکٹر محمد صابر نے اپنے مقالے میں اس لفظ کی مختلف شکلیں بتائی ہیں۔

''۱۔ Ordu

۲۔ Orda

۳۔ Urdu

۴۔ Orta

۵۔ Ordo

لیکن وہ Urdu (اُردو) قبلِ اسلام کی ترکی میں لفظ Ordu تلفظ ہوا ہے اور آج ترکوں کی اکثریت Ordu ہی تلفظ کرتی ہے۔ جدید ترکی میں بھی Ordu ہی تلفظ کرتے ہیں''۔(۳۲)

وہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر مزید لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ ترک ہماری زبان کو اُردو نہیں کہتے، کیونکہ اُردو کے معنی ہمیشہ وہ فوج کے لیتے ہیں۔ ہماری زبان کو تین ناموں سے ترک یاد کرتے ہیں:

۱۔Orducha (استانبولی لہجہ میں اُردوچہ)

۲۔Ordutili اُردو تیلی (استانبولی لہجے میں اُردودِلی)

۳۔Ordulisani اُردولسانی (یعنی لسان اُردو)

اس طرح ترک اپنی زبان کو ترکچہ (Turkche یا Turkdili) یا ترک لسانی کہتے ہیں۔ پرانے ترکی شعراور ادبا اپنی زبان کو ترکی بھی کہتے ہیں''۔(۳۳)

قدیم حوالوں میں اُردو کا نام سراج الدین خاں آرزو اپنی لغت نوادر الالفاظ (۱۶۸۹ء) میں اور اس کے بعد میر تقی میر نکات الشعراء (۱۷۵۰ء) اور ذکرِ میر میں اسے اُردوئے معلیٰ کہہ کر پکارتے ہیں۔ محمد حسین عطا خاں تحسین نے نوطرزِ مرصع (۱۷۷۵ء) میں زبانِ اُردو کے لیے اُردوئے معلیٰ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ بعد ازاں لفظ معلیٰ ترک کر دیا گیا اور صرف اُردو لکھا جانے لگا۔

حافظ محمود شیرانی کے مطابق:

''مغربی مصنفین میں گلکرسٹ نے پہلی بار 'قواعد زبانِ ہندوستانی' (۱۷۹٦ء) میں اردو کا استعمال کیا''۔(۳۴)

انشاءاللہ خاں انشا نے دریائے لطافت (۱۸۰۷ء) میں اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جس کا نام اردو رکھا''۔(۳۵)

اردو زبان کے لیے 'اردو' کے استعمال کی قدیم ترین مثال میر محمد دہلوی کے ہاں ملتی ہے، جو قائم کے شاگرد تھے۔ان کا دیوان ۱۷٦۱ء میں مرتب ہوا، جس میں اردو زبان کے لیے 'اردو' کا لفظ استعمال ہوا۔(۳٦)

اس کے بعد مصحفی کے ایک شعر میں زبان کے لیے اُردو کا لفظ استعمال کیا گیا:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق: یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے پہلے کا ہوسکتا ہے۔(۳۷)

ہ۔ دیگر مختلف نام

اُردو کے مختلف ناموں کے ضمن میں محققین اس بات پر متفق ہیں کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کی رعایت اور نسبت سے اُردو بعض اوقات: دکنی، دہلوی، گجری، گجراتی وغیرہ کہلاتی رہی۔حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ اہالِ دکن نے اُردو کا نام دکنی رکھا۔اہالِ گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گجری رکھ دیا۔لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے

باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے''۔(۳۸)

جب اردو جنوبی ہندوستان میں پہنچی تو دکن کے شعرا اور اہلِ قلم نے جنوبی ہند کی اردو اور شمالی ہند کی اردو میں فرق محسوس کرتے ہوئے اپنی زبان کو گجری اور دکنی کہا اور شمالی ہند کی زبان کو ہندی یا ہندوستانی۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم کے اشعار میں اس زبان کے لیے گجری اور رستمی (۱۶۴۹ء) اور شاہ ملک (۱۶۶۶ء) کے شعروں میں اس زبان کے لیے دکنی کا نام ملتا ہے۔(۳۹)

چونکہ یہ زبان دہلی میں بولی جاتی تھی، اس لیے امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ بہاء الدین باجن نے اردو کو زبانِ دہلوی کہا۔(۴۰)

حافظ محمود شیرانی کے بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے:

'' شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ اس کو زبانِ دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں''۔(۴۱)

ہندو اہلِ علم نے اسے کھڑی بولی کہا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ، للو لال اور سدل مصر نے اسے یہ نام دیا۔(۴۲)

سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک اردو کے لیے مختلف نام مروج رہے، لیکن انیسویں صدی سے اس کے لیے اردو کا نام مستعمل ہو گیا، جس کا چلن اب تک جاری ہے ۔ باقی سب متروک قرار پا چکے ہیں۔ اپنے ارتقائی سفر کے دوران اس کو مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ مختلف علاقوں اور ادوار میں اس کے نام بدلتے رہے۔ ہندی، ہندوی، دکنی، گجری، ہندوستانی، مورز، اُردوئے معلّٰی، اُردو کی زبان، ریختہ، دہلوی، زبانِ ہندوستان اور اُردو وغیرہ۔

اُردو نے ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں، اتنے ہی اس کے نام پڑتے گئے۔ اپنی ارتقائی سفر کے دوران مختلف علاقوں اور ادوار میں اس کے نام بدلتے رہے۔ ناموں کی اس تبدیلی کے پس منظر میں اس مخصوص دور کے لسانی، تہذیبی، تاریخی اور سیاسی وسماجی تغیرات اور امور کارفرما ہیں۔ اگر ان مختلف ناموں کو مختلف ادوار کے استعارے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی:اردو دب کا ابتدائی زمانہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی:۲۰۱۱ء:ص۱۲۔

۲۔ امیر خسرو: دیباچہ غرۃ الکمال: مطبع قیصریہ، دہلی:ص۳۳۔

۳۔ محولہ بالا:ص۶۶۔

۴۔ لباب الالباب، جلد دووم: مطبوعہ کیمرج:۱۹۰۲ء:ص۲۴۶: بحوالہ ڈاکٹر اشرف کمال۔

۵۔ حافظ محمود شیرانی:پنجاب میں اُردو (حصہ اول): مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد:۱۹۹۸ء:ص۴۰۔

۶۔ میر اثر:خواب و خیال مرتبہ مولوی عبدالحق: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی:۱۹۵۰ء ص۱۱۔

۷۔ پنجاب میں اُردو (حصہ اول):ص۳۷۔

۸۔ محمد حسین آزاد، مولانا: آبِ حیات: خزینۂ علم وادب، لاہور:۲۰۰۱ء:ص۲۷۔

۹۔ بحوالہ:پنجاب میں اُردو (حصہ اول):ص۲۶۔

۱۰۔ محولہ بالا:ص۳۰۔

۱۱۔ محولہ بالا:ص۳۳۔

۱۲۔ حافظ محمود شیرانی:مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد دوم:ص۲۷۔

۱۳۔ دیکھیے: میر تقی میر:نکات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی: ادارہ ادب ونقد، لاہور:۱۹۸۰ء:ص۱۵۷۔

۱۴۔ مصحفی: کلیاتِ مصحفی (دیوانِ اول) مرتبہ نثار احمد فاروقی: دہلی:۱۹۶۸ء:ص۱۴۵۔

۱۵۔ ولی: کلیاتِ ولی مرتبہ نور الحسن ہاشمی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی:۲۰۰۸ء:ص۱۳۳۔

١٦۔ اردو دب کا ابتدائی زمانہ:ص١٣۔

١٧۔ ڈاکٹر گریرسن:ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ،جلد٩،حصہ اول:ص٣:بحوالہ: داستانِ زبانِ اردو:ص١٢۔

١٨۔ بحوالہ: اُردو زبان کیا ہے ؟:ص٧٩۔

١٩۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی ،جلداول:ص٢۔

٢٠۔ سہیل بخاری:اُردو کا روپ:آزاد بک ڈپو،لاہور:١٩٧١ء:ص٩٧و٩٨۔

٢١۔ شوکت سبزواری،ڈاکٹر:داستانِ زبانِ اردو:انجمن ترقیِ اردو پاکستان،کراچی: ١٩٨٧ء:ص٥۔

٢٢۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی ،جلداول:ص١١۔

٢٣۔ محولہ بالا:ص٢٠۔

٢٤۔ میرامن:باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں:مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،دہلی:١٩٧٠ء:ص١٤۔

٢٥۔ ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر:جامع القواعد(حصہ صرف):مرکزی اُردو بورڈ لاہور: ٢٠٠٤ء:ص١٦۔

٢٦۔ اردو ادب کا ابتدا ئی زمانہ:ص١٦۔

٢٧۔ بحوالہ:نعمت الحق:اردو لسانیات کی تاریخ و تنقید (مقالہ پی ایچ۔ڈی اردو): بہاءالدین زکریا یونیورسٹی،ملتان:ص٣١٢۔

٢٨۔ بحوالہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے٢٠٠٠ءتک از سلیم اختر۔

٢٩۔ حکیم شمس اللہ قادری:اردوئے قدیم:جنرل پبلیشنگ ہاؤس برنس روڈ،کراچی:طبعِ دوم ١٩٦٣ء:ص٢٠و٢١۔

٣٠۔ لفظ اُردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر:اخبارِ اُردو،اسلام

آباد: جولائی ۱۹۸۷ء:ص۱۳۔

۳۱۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، **جلداول**:ص۲۰۔

۳۲۔ **محمد صابر، ڈاکٹر**: لفظ اُردو کی تاریخ (**مضمون**) **مطبوعہ در** اُردو نامہ، **کراچی**: **شمارہ۸: اپریل تا جون ۱۹۶۲ء**:ص۸۔

۳۳۔ **محولہ بالا**:ص۱۶۔

۳۴۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، **جلداول**:ص۴۲۔

۳۵۔ **انشاءاللہ خاں انشا**: دریائے لطافت **مترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی**: **انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی**: ۱۹۸۸ء:ص۲۔

۳۶۔ **گیان چند، ڈاکٹر**: لسانی مطالعے: **ترقیِ اردو بیورو، دہلی**: ۱۹۹۴ء ص۶۲۔

۳۷۔ لسانی مطالعے:ص۶۳۔

۳۸۔ پنجاب میں اُردو (**حصہ اول**):ص۳۹۔

۳۹۔ داستانِ زبانِ اردو:ص۱۷و۱۸۔

۴۰۔ **محولہ بالا**:ص۱۷۔

۴۱۔ پنجاب میں اردو:ص۵۳۔

۴۲۔ لسانی مطالعے: **ترقیِ اردو بیورو، دہلی**: ۱۹۹۴ء:ص۱۱۱۔

باب چہارم

اردو زبان کی تشکیل کے نظریات

فہرست مندرجات

اردو زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات

الف۔نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ

ب۔حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

ج۔سید سلیمان ندوی کا نظریہ

د۔امتیاز علی خاں کا نظریہ

ہ۔عین الحق فرید کوٹی کا نظریہ

و۔ڈاکٹر محی الدین قادری کا نظریہ

ذ۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نظریہ

ح۔ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ

ط۔ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ

ی۔فارغ بخاری کا نظریہ

اردو زبان کی تشکیل کے نظریات

اردو برِصغیر پاک وہند کی سب سے اہم اور ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ زبان ہے۔اس اہم زبان کی جڑوں کا کھوج لگانے کے لیے متعدد ماہرین نے کوششیں کیں اور اپنی تحقیق اور جستجو کا نچوڑ مختلف نظریات کی صورت میں پیش کیا۔

اردو زبان کی ابتدا اور پیدائش کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات ملتے ہیں۔ان تمام نظریات میں البتہ ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتدا کی بنیاد برِصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی۔ان نظریات کو پیش کرنے والے محققین میں اُردو کے ادیب اور زبان دان بھی ہیں اور جدید ماہرینِ لسانیات بھی۔

اردو زبان کے آغاز سے متعلق پیش کردہ نظریات کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ نظریات، جن میں اردو کی پیدائش کسی علاقے سے منسوب کی جاتی ہے۔اس گروہ میں: سید سلیمان ندوی، نصیرالدین ہاشمی، حافظ محمود شیرانی، فارغ بخاری وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۔ وہ نظریات، جن میں اردو زبان کی پیدائش کسی زبان یا بولی کے ارتقا سے منسوب کی جاتی ہے۔ان میں: میر امن، مولانا محمد حسین آزاد، عین الحق فرید کوٹی، سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر سہیل بخاری خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔

یہاں نظریات کا حوالہ دیتے ہوئے تاریخی تقدیم و تاخیر کا خیال رکھا گیا ہے۔ برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے اور اردو کے آغاز و ارتقا کا اس

کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔مسلمان جب یہاں آئے تو اپنے ساتھ اپنا پورا تہذیبی پس منظر لے کر آئے اور پھر یہاں رچ بس گئے۔مسلمان:عربی،فارسی اور ترکی بولتے ہوئے آئے تھے اور جب مقامی لوگوں کے ساتھ ان کا میل جول ہوا تو ایک لسانی ارتباط کا عمل شروع ہوا۔مقامی زبانوں اور بولیوں پر ان کی زبانوں کا اثر ہونا شروع ہوا اور باہمی لسانی لین دین کے عمل کا آغاز ہوا۔اس طرح مسلمانوں کی آمد سے ہند آریائی زبانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔اردو بھی ایک ہند آریائی زبان ہے اور ہندو مسلم تہذیب کے اتصال کی یادگار ہے۔اس ضمن میں حافظ محمود شیرانی رقم طراز ہیں:

''ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اُردو زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے اور جوں جوں ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی، یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی''۔(۱)

ڈاکٹر ابوللیث صدیقی کہتے ہیں:

''اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ، آویزش اور ربط واتباط کا نتیجہ ہے ------۔اُردو ایسی زبان نہیں، جسے مسلمان اپنے ساتھ عرب، ایران، افغانستان یا ترکستان سے لائے ہوں، نہ یہ ایسی زبان ہے، جو یہاں پہلے سے موجود تھی اور مسلمانوں نے اپنی عربی، فارسی یا ترکی چھوڑ کر اسے اختیار کیا ہو''۔(۲)

سنیتی کمار چٹرجی کا تو یہاں تک خیال ہے کہ:

''اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات نہ حاصل کی ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں بنتیں، لیکن انھیں جو باوقار ادبی حیثیت حاصل ہوگئی، اس

میں ضرور دیر ہوتی ۔اس طرح اُردو کے لیے زمین ہموار ہوگئی،جس کا رشتہ براہِ راست سنسکرت سے نہیں، بلکہ اب بھرنش اور بول چال کی شور سینی پراکرت سے ہوتا ہوااس آریائی ماخذ تک پہنچ جاتا ہے،جس نے خود ویدک سنسکرت اور سنسکرت کو جنم دیا''۔(۳)

میرامن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا تھا:

''حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے،تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم:قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے،لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین،سودا سلف،سوال جواب کرتے ،ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی''۔(۴)

معروف انشاپرداز مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کا آغاز ان جملوں سے کیا:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان سے ہے،لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے''۔(۵)

بعض محققین اور مؤرخین نے اپنے نظریے کو نسبتاً پھیلا کر پیش کیا اور اپنے نظریے کی صداقت منوانے کے لیے دلائل اور براہین پیش کیے۔اس میں شبہ نہیں کہ ان مؤرخین اور محققین کے نظریات صداقت سے خالی نہیں،تاہم ان کو کلی طور پر تسلیم کرنا ممکن بھی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان نظریات کے خلاف ردِعمل بھی سامنے آیا۔ذیل میں ان نظریات کا تعارف پیش

کیا جاتا ہے۔

الف۔نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ

معروف محقق نصیر الدین ہاشمی اردو کی جائے پیدائش دکن کو قرار دیتے ہیں۔تاہم انھوں نے دوٹوک اور قطعی انداز میں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُردو کا مولد دکن ہے۔اپنی تصنیف دکن میں اردو کے پہلے باب کے آغاز میں اُردو کی ابتدا کے متعلق چند نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے،اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی۔وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا،کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے انھیں مقامات پر ہوئی''۔(۶)

لیکن ان دونوں مقامات پر اسلامی اثرات کے نفوذ اور ہندو مسلم آبادی کے اختلاط سے پیدا شدہ لسانی صورتِ حال کے تجزیے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''اب یہ امر خاص طور پر غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قائم کی؛تجارت کی؛مذہب کی اشاعت کی؛تعلیم دی، ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ہر وقت کام کاج،خرید و فروخت میں ان سے سابقہ رہتا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا،جو دونوں غیر قوموں کے لیے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔اس لحاظ سے،جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے،وہ

بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے، مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں، وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں، اس لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے''۔(۷)

ب۔حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اُردو منظر عام پر آئی، جس کی لسانی تحقیق کے حوالے سے بڑی اہمیت ہے۔عرضِ حال میں تحریر کرتے ہیں:

''اردو زبان کے آغاز کا سرزمینِ پنجاب سے منسوب کرنا کوئی نیا طریقہ یا عقیدہ نہیں ہے۔اس سے پیشتر شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پرلطف تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں، مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے''۔(۸)

وہ اس کتاب کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔اس نظریے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں، لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی ساخت، نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں''۔(۹)

تاریخی اور سیاسی واقعات اور شواہد کے علاوہ حافظ محمود شیرانی اردو اور پنجابی کی لسانی

شہادتوں اور مماثلتوں سے دونوں زبانوں کے قریبی ربط و تعلق کو واضح کر کے اپنے نظریے کی صداقت پر زور دیتے ہیں کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو اپنی صرف ونحو میں پنجابی وملتانی کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماو افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا، بلکہ ان کے توابعات وملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر وتانیث کے قواعد، افعالِ مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصد سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں''۔(۱۰)

اسی کتاب کے صفحات ۷۱ تا ۸۵ اردو اور پنجابی مماثلت اور مشابہت کے قواعد پر تفصیل سے بحث کر کے دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی وضاحت کی ہے، جن کے مطالعے سے اردو اور پنجابی زبان کے زبردست صرف ونحوی اشتراک کا پتا چلتا ہے اور موصوف کے استدلال کو تقویت ملتی ہے۔ ڈاکٹر گراہم بیلی، ڈاکٹر گریرسن، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی، پنڈت دتاتریہ کیفی اور ڈاکٹر جمیل جالبی بھی اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ اگرچہ جدید ماہرینِ لسانیات نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے پر سخت تنقید کی ہے اور اسے ماننے سے انکار کیا ہے۔ تاہم ابھی تک یہ سب سے زیادہ مقبول نظریہ ثابت ہوا ہے۔

ج۔ سید سلیمان ندوی کا نظریہ

سید سلیمان ندوی کی تصنیف نقوشِ سلیمانی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، جس میں مختلف مضامین اور خطبے شامل ہیں۔ ۱۹۳۳ء کے ایک مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان سندھ میں معرضِ وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ طویل بحث کے بعد نتیجہ اخذ

کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا.................جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، یعنی جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے، جس کو دہلوی کہتے ہیں، مل کر معیاری زبان بن گئی''۔(۱۱)

د۔ امتیاز علی خاں عرشی کا نظریہ

امتیاز علی عرشی نے اردو اور پشتو کے باہمی تعلق پر اولین اور قابلِ قدر کام کیا۔ وہ اپنی تصنیف اردو میں پشتو کا حصہ میں رقم طراز ہیں:

''اردو زبان کی پیدائش کا سب سے بڑا سبب ہندوستان میں افغانیوں کی آمد تھی اور اس نئی زبان میں عام طور پر بولے جانے والے عربی، فارسی، ترکی اور مغلئی الفاظ کا بڑا حصہ بھی افغانیوں ہی کی زبان اور ان ہی کی وساطت سے داخل ہوا ہے''۔(۱۲)

اردو اور پشتو کی چند لفظی مماثلتیں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''پشتو اور اردو میں نہ صرف ذخیرۂ الفاظ اور تہذیبی اثرات کا بیشتر سرمایہ مشترک ہے، بلکہ فارسی اثرات نے فکر و اظہار کی سطح پر دونوں زبانوں کو ایک

دوسرے سے اور قریب کر دیا ہے۔ اردو اور پشتو کے لسانی، تہذیبی اور تاریخی تعلق کا مطالعہ کسی محمود شیرانی کا منتظر ہے''۔(۱۳)

ہ۔عین الحق فرید کوٹی کا نظریہ

اردو کی ابتدا کے بارے میں عین الحق فرید کوٹی اپنے نظریے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اردو زبان کی بنیادیں وادیِ سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلۂ نسب پنجابی، اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جاملتا ہے، جو آریاؤں کی آمد سے قبل وادیِ سندھ میں مروج تھی''۔(۱۴)

عین الحق فرید کوٹی نے دراوڑ گروہ کی زبانوں (تامل، تلگو، کنڑ، ملیالم) اور پنجابی، اردو کے جو تقابلی خاکے دیے ہیں، وہ بیشتر اسما پر مشتمل ہیں، حالانکہ زبانوں کی ساخت کا فیصلہ ان کے اسما کی بجائے افعال پر ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تمام قابلِ ذکر ماہرینِ لسانیات نے اردو کو ہندی زبان قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے دراوڑ زبانوں کو اردو کا ماخذ قرار دینا قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

و۔ڈاکٹر محی الدین قادری کا نظریہ

ڈاکٹر محی الدین قادری اردو کے پہلے ماہرِ لسانیات ہیں۔ جدید لسانیات سے اردو کو روشناس کرانے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے لندن سے ہندوستانی صوتیات کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی۔ ان کی تصانیف: Hindoustani Phonetics (انگریزی) اور ہندوستانی لسانیات نے لسانیات کے طلبہ اور

محققین کے لیے مشعلِ راہ کا کام کیا۔ ان کے بقول:

''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جاچکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی، جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پائے تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے، جو بالعموم 'نئے آریائی دور' میں اس حصہ ٔملک میں بولی جاتی تھی، جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے، جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی، مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے، جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی، کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ ان کی اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت پتا چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل بارھویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش شروع کی جو، آج انھیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں''۔ (۱۵)

ذ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نظریہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد مقدمہ تاریخِ زبان میں ڈاکٹر مسعود حسین

خاں نے اردو کے برج بھاشا، پنجابی اور دکنی زبانوں سے تعلق کو مسترد کر کے ہریانی کو اردو کا ماخذ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کی ابتدا کے سلسلے میں نئے نظریے کی تشکیل اس طور پر کی جاسکتی ہے کہ ہم نواحِ دہلی کی تمام بولیوں کا تقابلی مطالعہ کریں اور دکنی زبان کی خصوصیات کو پنجابی کی بجائے ان میں پہچاننے کی کوشش کریں۔ ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید روپ ہی پیشِ نظر نہ رہیں، بلکہ ان قدیم نمونوں کا بھی جائزہ لیں، جو دستیاب ہیں۔ مذکورہ بالا تقابلی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں اور جب پندرھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطینِ دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے''۔(۱۶)

ح۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ اردو زبان کا ارتقاء ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی دو اہم لسانی تصانیف: داستانِ زبانِ اردو ۱۹۶۰ء میں اور اردو لسانیات ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئیں۔ اپنے تحقیقی مقالے میں اردو کے مولد اور آغاز کے بارے میں وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے، جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے، پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے، اس حالت کو پہنچی، جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی: ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشی ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی''۔(۱۷)

داستانِ زبانِ اردو میں لکھتے ہیں:

''اردو: ہندوستانی سے ترقی پا کر پہنچی، جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی: دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی''۔(۱۸)

وہ اپنے دعوے کی صداقت پر مزید استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اردو اگر پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اس کی حیثیت ایک شاخ یا بولی سے زیادہ نہ ہوتی، کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان کی شاخ، جسے اپنی اصل سے جدا ہوئے زیادہ مدت نہ گزری ہو، بنیادی طور پر اپنی اصل سے مختلف نہیں ہوتی۔ یہی حال ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں کا ہے۔ کوئی ایک زبان بھی اردو سے ایسی مناسبت نہیں رکھتی، جس کو دیکھ کر بلا تأمل کہا جا سکے

کہ اردو اس زبان سے ماخوذ ہے۔زبان کا مولد وہی ہوتا ہے، جہاں وہ بلاشرکت غیرے بولی جائے۔سندھ، پنجاب، اودھ، بہار اور گجرات جہاں کہیں بھی اردو نے رسائی حاصل کی۔اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں کی مقامی بولیاں بھی عام بول چال کی زبانیں بنی رہیں۔صرف مخصوص طبقے اس نئ زبان کو اپنا سکے۔عوام اور پسماندہ طبقوں میں بولیاں ہی رائج رہیں، لیکن یوپی کے مغربی اضلاع: دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں بولی جاتی۔صرف اردو ہی ہے، جو عوام اور خواص کی عام بول چال کی زبان ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے اردو ان ہی علاقوں میں پیدا ہوئی، جس کی وجہ سے یہ لوگ اس کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور اس میں گفتگو کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے شہروں اور دیہاتوں میں آنکھ کھول کر یہی زبان دیکھی اور اس کو اختیار کیا''۔(۱۹)

ط۔ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ

ڈاکٹر سہیل بخاری اپنے ایک تحقیقی مضمون بعنوان قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ میں تحریر کرتے ہیں:

''ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس برِصغیر کی تمام زبانیں دراوڑی، یعنی ہندوستانی ہیں۔ان کا اپنا ایک خاندان ہے، جو بیرونِ ہند کے دوسرے خاندانوں سے مختلف ہے۔چنانچہ وہ خصوصیات، جو اسے ہمالیہ کے اس پار کی زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں، ان تمام زبانوں میں مشترک

ملتی ہیں کہ یہی ان کے دراوڑی ہونے کی پہچان ہے''۔(۲۰)
وہ اپنی تصنیف اردو کا روپ میں رقمطراز ہیں:

''اردو بولی کے جنم پر جس جس نے جو کچھ کہا ہے،اس کی جانچ پرکھ اور چھان پھٹک کر کے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اردو ہی نہیں، ہندوستان کی سبھی بولیاں، جو آج کل بولی جارہی ہیں،آریوں کے ہندوستانی میں آنے سے پہلے بھی بولی جاتی تھیں''۔(۲۱)

ایک اور مقام پر ڈاکٹر سہیل بخاری کھڑی بولی (مہاراشٹری) کو اردو کی اساس قرار دیتے ہیں۔

ی۔فارغ بخاری کا نظریہ

فارغ بخاری وہ محقق ہیں،جنھوں نے اردو کا مولد سرحد کو قرار دیا۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو کی جنم بھومی درحقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے۔اردو، جو سنسکرت اور فارسی کے اختلاط کا نتیجہ تھی،اس کا خمیر سرحد کے سنگلاخ ماحول میں اس وقت سے تیار ہورہا تھا، جب ایرانیوں نے پہلے پہل ہندوستان پر دھاوے بولنے شروع کیے۔ایرانیوں کی آمد کا آغاز ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوری کے حملوں سے ہوا اور سترھویں صدی عیسوی میں نادر شاہ درانی کے عہد تک مسلسل طور پر یہ یلغار جاری رہی''۔(۲۲)

فارغ بخاری کے مطابق اردو کا ماخذ ہندکو ہے:

''اردو نے پشتو کے بطن سے جنم لیا۔ہندکو اس کی ابتدائی شکل ہے، جو آج بھی شمال مغربی صوبہ سرحد کے مرکزی شہروں میں رائج ہے۔اس کے لوگ

گیت اب بھی قدیم اردو کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ لوک گیت سرحد کے علاوہ ہندوستان کے ان مقامات پر بھی ملتے ہیں، جہاں جہاں افغان: پشتو اور ہندکو کے بیج لے کر پہنچے اور وہاں انھوں نے اردو زبان کا پودا لگایا''۔(۲۳)

بعد میں خاطر غزنوی نے اردو زبان کا ماخذ ہند کو لکھ کر اس نظریے کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

پشتو اور اردو کے باہمی تعلق کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ محض کچھ ذخیرۂ الفاظ کی بنا پر کسی زبان کو دوسری زبان کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا اور جہاں تک ہندکو کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندکو پنجابی کا ایک لہجہ ہے اور ہندکو اور اردو میں تقریباً وہی لسانی مماثلتیں ہیں، جو پنجابی/ملتانی اور اردو میں ہیں، لیکن تاریخی اور سیاسی حالات اس امر کی تائید نہیں کرتے، اس لیے لسانی ماہرین نے ان نظریات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔

پشتو اور اردو میں اس طرح کی کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی، جس کی بنیاد پر پشتو کو اردو کا ماخذ قرار دیا جا سکے۔ ان کے رسم الخط اور حروفِ تہجی میں بھی فرق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان دونوں زبانوں کے خاندان الگ ہیں۔ اردو ہند آریائی، جبکہ پشتو ہند ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

گذشتہ سطور میں بیان کردہ نظریات وہ ہیں، جو بہت معروف ہیں یا لسانی لحاظ سے وزنی اور وقیع ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظریات ایسے بھی ہیں، جو لسانی اور تحقیقی لحاظ سے کمزور ہیں۔ ان میں ماہرین نے یا تو محض اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا دوسرے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے اپنی رائے دی ہے، اس لیے ان سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ ان ماہرینِ زبان وادب کی فہرست میں: سرسید، امام بخش صہبائی، حسام الدین راشدی، مولوی عبدالحق،

ڈاکٹر گریرسن، ڈاکٹر ہارنل (Dr.Heornle)، ڈاکٹر گیان چنداور ڈاکٹر گراہم بیلی جیسی شخصیات کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اگر چہ اکثر ماہرین اور محققین نے اپنا نظریہ پیش کرتے وقت اپنے سے پیشتر پیش کیے گئے نظریات پر تنقید کی ہے اوران کی صداقت سے انکار کیا ہے۔متعدد ماہرینِ لسانیات اور ناقدین نے ان نظریات پر بحث کی ۔نمونے کے طور پر ہم یہاں دو کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جن میں ایک اردو زبان کا آغاز- مختلف نظریے اور حقائق (مصنفہ ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی ریڈر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی انڈیا) ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۱۹۹۳ء میں زیورِطبع سے آراستہ ہوکر منظرِعام پر آئی۔کتاب کی داخلی شہادت کے مطابق یہ کتاب جموں یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہے۔اختتامیے میں بحث کو سمیٹتے ہوئے، وہ لکھتی ہیں:

> ''مختلف ماہرینِ لسانیات کے بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آریوں کے داخلۂ ہندوستان سے لے کر مسلمانوں کی فتوحات تک تقریباً ہر زمانے میں 'مدھیہ ویش' میں بولی جانے والی زبان کو ہی اہمیت حاصل رہی اور ۱۰۰۰ء کے آس پاس شور سینی اپ بھرنش پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی، جیسے جیسے شور سینی اپ بھرنش ادبی شکل اختیار کرتی گئی، ویسے عوام کی زبان اس کی جگہ لیتی گئی اور ترقی کرتی گئی، اس زبان کو گریرسن نے مغربی ہندی کا نام دیا، جس سے آگے چل کر اردو بنی۔اردو کی پیدائشی کا زمانہ ۱۰۰۰ء سے ۱۱۹۳ء تک مقرر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ مغربی ہندی کے حدود بھی وہی ہیں، جو 'مدھیہ ویش' کے ہیں، اس لیے ہمارا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اردو کا جنم، مدھیہ ویش

میں ہوا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ مغربی ہندی ہے اور اس کا صحیح مولد ومنشا ہے: مدھیہ ویش''۔(۲۴)

ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی خود مدھیہ ویش کا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہیں:

''مدھیہ دیش کو قدیم زمانے سے' آریائی ہند کا قلب' سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ علاقہ ہندوستان کا مرکز تھا۔ ہندومت کی اعلیٰ اور مقدس سرزمین کی حیثیت سے وسطی علاقے کی شہرت و ناموری کو ہر جگہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ بھی اپنی شائستگی اور اپنی افضل واعلیٰ تہذیب پر نازاں تھے۔ اس کی حد بندی شمال میں ہمالیہ، جنوب میں وندھیا چل، مغرب میں سرہند (پنجاب) سے لے کر مشرق میں الہ آباد اور روہیل کھنڈ (یوپی) تک کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق اس کے مشرقی سرے سے مغربی سرے تک سرسوتی نام کا مقدس دریا بہتا ہے، جو انسانی آنکھ سے اوجھل ہے۔ گنگا جمنا کے درمیان کا دوآبہ مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب سب اس میں شامل ہیں۔ متھرا اور اس کے اردگرد کا علاقہ بھی اس میں شامل ہے۔ سنسکرتی عہد کے جغرافیے میں، جس علاقے کا نام بار بار آیا ہے اور جسے خالص آریوں کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے، یہی مدھیہ پردیش ہے''۔(۲۵)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مغربی پنجاب کو کیوں نظر انداز کر رہی ہیں؟ حالانکہ ابتدائیے میں برج بھاشا کے نظریے کو سراسر غلط اور اردو کے پنجابی سے نکلنے کے نظریے کو سراسر غلط فہمی قرار دینے کے بعد اگلی سطور میں یہ تسلیم کرتی ہیں کہ:

''پروفیسر شیرانی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اردو اور پنجابی دونوں کی ولادت

کا ایک ہی مقام ہے۔ اردو اور پنجابی چونکہ ایک ہی علاقے میں پیدا ہوئیں اور دونوں ہی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہیں، اس لیے دونوں میں مشترکہ خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے''۔(۲۶)

اس کے بعد ڈاکٹر زور، ڈاکٹر چٹر جی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اردو کے آغاز کے نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ حقیقت کہیں انھیں کے درمیان پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کی تلاش شروع کی۔ اس تلاش کے دوران معلوم ہوا کہ ہر ایک نے جزوی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ کسی نے صرف پنجاب کو مولد قرار دیا اور کسی نے صرف دوآبۂ گنگ و جمن، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی جائے پیدائش مدھیہ دیش ہے، جس میں مشرقی پنجاب، دوآبۂ گنگ وجمن اور مغربی یو پی شامل ہیں''۔(۲۷)

ان کی تصنیف کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے سے یہ مفروضہ بنالیا کہ اردو مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئی اور پھر تمام ماہرین کے اندراجات پر تنقیحات قائم کر کے محاکمہ کرتے ہوئے اپنے مفروضے کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

دوسری کتاب اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات مرتبہ پروفیسر ایوب صابر ہے، جو بھی اتفاق سے ۱۹۹۳ء ہی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ مصنف کے مطابق یہ کتاب پشاور یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے طلبہ کے لیے لکھی گئی۔

انھوں نے حرفِ آخر میں بحث درج ذیل نکات میں سمیٹی ہے:

''۱۔ اردو اپنی اصل کے اعتبار سے آریائی زبان ہے۔ اس کا رسم الخط اور

ذخیرۂ الفاظ عربی سے آیا ہے، جو سامی خاندان کی زبان ہے۔عربی کے علاوہ فارسی الفاظ کا ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا ہے۔متعدد دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں شامل ہوئے ہیں ۔گذشتہ دو سو برس سے انگریزی الفاظ بھی اردو میں دخیل ہورہے ہیں۔

۲۔ اردو کا مولد دہلی ہے اور اس کا آغاز ۱۱۹۳ء قرار دیا جاسکتا ہے۔اس سال مسلمانوں نے دہلی کو فتح کیا تھا''۔(۲۸)

ایوب صابر نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کے رد میں کوئی مدلل بحث نہیں کی۔محض ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات پیش کردیے اور ان نظریات کے تقابلی جائزے سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔کتاب کا مجموعی انداز ایسا ہے کہ صرف عنوانات کے تحت نظریات پیش کردیے گئے ہیں اور آخر میں نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اس اہم دلیل کو بنیاد بنایا ہے کہ زبان کا مولد وہی ہوتا ہے، جہاں وہ بلاشرکت غیرے بولی جائے،لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم دکنی،اردو اور پنجابی میں گہرا اشتراک اور مماثلت پائی جاتی ہے اور وقت کے ساتھ اردو میں یہ نکھار آیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان تمام نظریات کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کے آغاز اور مولد و جائے پیدائش کا مسئلہ تا حال الجھا ہوا اور متنازع فیہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان ایک سماجی عمل ہے، جس کا ارتقا صدیوں کے سماجی روابط،معاشرتی انقلابات اور تبدیلیوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے،اس لیے زبان کے آغاز اور پیدائش سے متعلق کسی مخصوص عرصے کا تعین کرنا بہت مشکل ہے،لیکن یہ اردو زبان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے کہ ہر زبان والے اور ہر علاقے کے لوگ اردو کی ابتدا کو اپنے آپ سے منسوب کرتے ہیں۔

ان نظریات کو پیش کرتے وقت دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اکثر ماہرین نے اردو اور متعلقہ زبان کی لسانی مماثلت اور اختلاف کا ذکر کیا ہے، جس سے آئندہ تحقیق کے لیے راستہ ہموار ہوگیا ہے۔اب تقریباً تمام قابلِ ذکر پاکستانی زبانوں اور اردو کے لسانی اشتراک پر یونیورسٹیوں میں مقالے لکھے جا چکے ہیں، لیکن افسوس کہ اکثر مقالات میں وہ معیار سامنے نہیں رکھا گیا، جس کی ضرورت تھی۔حالانکہ حافظ محمود شیرانی کی تصنیف پنجاب میں اردو ۱۹۲۸ء کی صورت میں ایک بہترین نمونہ سامنے موجود تھا۔

ان تمام نظریات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تقریباً سارے نظریات میں جذباتی پہلو زیادہ حاوی ہے اور ہر محقق نے اپنے جذبات کی تسکین اور اپنے اختیار کردہ مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کردی ہیں۔پیش کردہ نظریات میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات زیادہ معتبر مانے جاتے ہیں۔ان نظریات کی جانچ پرکھ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اُردو کے آغاز و ارتقا کا سفر پنجاب سے دوآبۂ گنگ وجمن تک ہے۔اس سفر کے دوران ہر علاقے (چاہے وہ برج ہو، ہریانہ ہو، میرٹھ ہو یا دہلی) نے اس کی ترقی و ارتقا میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ایک ایسی زبان، جس نے پورے برصغیر کی رابطہ زبان (Lingua Franca) بننا تھا، اس کا کینوس بھی اتنا ہی وسیع ہونا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کے مولد کا کھوج لگانے کی خاطر معروضی اور سائنسی طریقۂ کار سے کام لیا جائے غیر جانبدارانہ انداز میں مربوط و منظّم تحقیق ہو، جس میں تمام زمینی حقائق، تاریخی وسیاسی حالات اور لسانی ارتقائی عمل، غرض تمام اساسی پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے۔

حوالہ جات

۱ . **حافظ محمود شیرانی**: مقالاتِ محمود شیرانی، **جلد اول**: **مجلس ترقیِ ادب،لاہور: ۱۹۷۴ء:ص ۵۵.**

۲ . **ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر**: ادب و لسانیات:**اُردو اکیڈمی سندھ ،کراچی: ۱۹۷۰ء: ص ۲۰۴ و ۲۰۵.**

۳. **بحوالہ**: اُردو قومی یکجہتی اور پاکستان **از ڈاکٹر فرمان فتح پوری.**

۴. **میر امن**:باغ و بہار**مرتبہ ڈاکٹر ابو الخیر کشفی : اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی: ۱۹۶۵ء: ص ۷۷.**

۵. **محمد حسین آزاد، مولانا**: آبِ حیات: **خزینۂ علم و ادب لاہور : ۲۰۰۱ء: ص ۱۴ .**

۶ . **نصیر الدین ہاشمی** : دکن میں اُردو: **ترقیِ اُردو بیورو،نئی دھلی : ۱۹۸۵ ء:ص ۳۲و۳۳.**

۷. **محولہ بالا:ص۳۵و ۳۶.**

۸. **حافظ محمود شیرانی**: پنجاب میں اُردو : **مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد:۱۹۹۸ء :ص ۴ .**

۹. **محولہ بالا: ص۸ .**

۱۰ . **ایضاً.**

۱۱ . **سید سلیمان ندوی** : نقوشِ سلیمانی : **اُردو اکیڈمی سندھ ،کراچی: ۱۹۶۷ء:ص ۳۱تا۳۳.**

١٢. **امتیاز علی عرشی:** اُردو میں پشتو کا حصہ:**پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی،پشاور: ١٩٦٠ء:ص ۴۴.**

١٣. **امتیاز علی عرشی : بحوالہ تاریخ ڈاکٹر جمیل جالبی:** تاریخِ ادبِ اُردو،**جلد اول: مجلس ترقیِ ادب، لاہور :١٩٩٥ء: ص ۷۳.**

١۴. **عین الحق فرید کوٹی:** اُردو زبان کی قدیم تاریخ: **اورینٹ ریسرچ سنٹر، لاہور:١٩٨٨ء:ص ٩٣.**

١٥. **سید محی الدین قادری، ڈاکٹر:** ہندوستانی لسانیات : **شمس الاسلام پریس، حیدر آباد دکن: ١٩٣٢ء:ص٨٨و ٨٩.**

١٦. **مسعود حسین خان، ڈاکٹر:** مقدمہ تاریخِ زبانِ اُردو: **اُردو مرکز، لاہور : ١٩٦٦ء:ص ١٨٢و١٨٣.**

١۷. **شوکت سبزواری، ڈاکٹر:** اُردو زبان کا ارتقاء : **پاک کتاب گھر، ڈھاکہ: ١٩٥٦ء : ص ٨۷.**

١٨. **شوکت سبزواری، ڈاکٹر** : داستانِ زبانِ اُردو :**انجمن ترقیِ اُردو پاکستان،کراچی: ١٩٦٠ء:ص ٥٢.**

١٩. **محولہ بالا:ص ٩٣.**

٢٠. **بحوالہ :** اُردو زبان کی قدیم تاریخ : **ص ٦٦.**

٢١. **سہیل بخاری، ڈاکٹر** : اُردو کا روپ: **آزاد بک ڈپو، لاہور: ١٩۷١ء : ص ۷۷.**

٢٢. **فارغ بخاری:**سرحد میں اُردو **مشمولہ در** سنگِ میل، **پشاور (سرحد نمبر): ص ١٣٣.**

۲۳. **فارغ بخاری** : ادبیاتِ سرحد (**جلد سوم**) :**نیا مکتبہ، پشاور**: **۱۹۵۵ء:ص ۱۲۶.**

۲۴. **خورشیدحمرا صدیقی، ڈاکٹر**: اردو زبان کا آغاز۔ مختلف نظریے اور حقائق:**شمع پبلی کیشنز، جموں، انڈیا:۱۹۹۳ء :ص ۲۲۹.**

۲۵. اردو زبان کا آغاز۔ مختلف نظریے اور حقائق: **ص ۲۲۱.**

۲۶. **محولہ بالا:ص ۱۲.**

۲۷. **محولہ بالا:ص۱۳و۱۴.**

۲۸۔ *ایوب صابر، پروفیسر*:اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات: *سرحداردواکیڈمی،ایبٹ آباد*:۱۹۹۳ء:ص۱۱۹۔

باب پنجم

اُردواور پاکستانی زبانوں کا ربطِ باہم

اُردواور پاکستانی زبانوں کا ربطِ باہم

اُردواور پاکستانی زبانوں میں کئی پہلواور عناصر مشترک ہیں۔رسم الخط اور حروفِ تہجی میں اشتراک ہے۔ اِن کا تہذیبی وثقافتی پس منظر ایک ہے۔ چونکہ عربی دینی اور علمی زبان اور فارسی تہذیبی وسرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے تمام علاقائی زبانوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہے اس لیے اُردواور پاکستانی زبانوں کی لغت اور ذخیرۂ الفاظ کا بہت بڑا حصہ مشترک ہے۔قواعد میں کافی حد تک مماثلت اور اشتراک ہے۔مزید یہ کہ اِن زبانوں میں موجود دینی ادب سب بولنے والوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ دینِ اسلام کے اس رشتے نے اِن سب زبانوں کو ایک روحانی اتحاد میں یکجا کرر کھا ہے۔اُردوسائنس بورڈ کی شائع کردہ ہفت زبانی لغت میں ایک ہی لفظ سات زبانوں میں ایک ہی مفہوم میں استعمال ہورہا ہے۔ پروفیسر پریشان خٹک کی تصنیف لسانی رابطہ (مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) میں ساڑھے تین ہزار سے زائد ایسے الفاظ کی نشاندہی کی گئی ہے، جوتھوڑے بہت فرق کے ساتھ اُردو، پنجابی،سندھی، پشتو اور بلوچی میں یکساں طور پر مستعمل ہیں۔

نمونے کے طور پر کچھ الفاظ کی فہرست درج ذیل ہے:

اُردو	سندھی	پشتو	پنجابی	بلوچی
آباد	اَباد	اَباد	آباد	آبات
آبادکار	آبادکار	آبادکار	آبادکار	آبات کار
آبادکاری	آبادکاری	آبادکاری	آبادکاری	آبات کاری
آبادی	اَبادی	اَبادی	اَبادی	آباتی

آخر	آخر	آخر	اُخیر	اَخیر
اَبّا	اَبّو	اُبا(ا)	اَبّا(پیو)	اَبّا
اَبتر	ابتر	بتر	بتّر	گنتر
ابجد	ابجد	ابجد	ابجد	ابجد
اِتوار	اِتوار	اتوار	اِتوار	اِتوار
اثر	اثر	اثر	اثر	اثر
بابا	بابا	بابا	بابا	بابا
بابت	بابت	بابت	بابت	بادَو
بادام	بادام	بادام	بادام	بادام
بادشاہ	بادشاہ	بادشاہ(باچا)	بادشاہ	بادشاہ
بارانی	بارانی	بارانی	بارانی	بارانی
پاکی	پاکی	پاکی	پاکی	پاکی
پارا	پارو	پارہ	پارا	پارا
تابعدار	تابعدار	تابعدار	تابعدار	تابعدار
تاثیر	تاثیر	تاثیر	تاثیر	تاثیر
تار	تار	تار	تار	تار
تاریخ	تاریخ	تاریخ	تاریخ	تواریخ
تازہ	تازو	تازہ	تازہ	تاجگ
تان	تان	تان	تان	تان

ٹماٹر	ٹماٹر	تھماتھر	ٹماٹر	ٹماٹر
تبدیلی	تبدیلی	تبدیلی	تبدیلی	تبدیلی
ثابت	ثابت	ثابت	ثابت	ثابت
ثنا	ثنا	ثنا	ثنا	سَنا
ثبوت	ثبوت	ثبوت	ثبوت	ثبوت
ثواب	ثواب	ثواب	ثواب	ثواب
جادو	جادو	جادو	جادو	جاتو
جاسوس	جاسوس	جاسوس	جاسوس	جاسوس
جاہل	جاھل	جاھل	جاہل	جاھل
جذبہ	جذبو	جذبہ	جذبہ	جوزہ
جُرم	جُرم	جرم	جُرم	ملام
چابک	چابک	چابک	چابک(چھانٹا)	چابک
چابی	چابی(کُنجی)	چابی(کُنجی)	کنجی	کلیت
چاقو	چاقو(کپ)	چاقو	چاقو	چانکو
چال	چال	چال	چال	رواج
چکر	چکر	چکر	چکر	چکر
حاجت	حاجت	حاجت	حاجت(لوڑ)	حاجت
حاجی	حاجی	حاجی	حاجی	حاجی
حاسد	حاسد	حاسد	حاسد	حسدی

حاضری	حاضری	حاضری	حاضری	حاضری
حالات	حالات	حالات	حالات	احوال
خاکی	خاکی	خاکی	خاکی	خاکی
خالق	خالق	خالق	خالق	پیداکنوک
خالی	خالی	خالی	خالی	هورک
خان	خان	خان	خان	خان
خراب	خراب	خراپ	خراب	حراب
دال	دال	دال	دال	دال
داغ	داغ	داغ	داغ	داغ
داستان	داستان	داستان	داستان	داستان
دانا	دانا	دانا	دانا	دانا
درست	درست	درست	درست	بروبر
ذات	ذات	ذات	ذات	ذات
ذمه	ذمو	ذمه	ذمه	ذمه
ذہین	ذھین	ذھین	ذہین	رُژنی
ذریعه	ذریعو	ذریعه	ذریعه	سَوب
ذِکر	ذِکر	ذکر	ذِکر	ذِکر(گیرآری)
رابطه	رابطو	رابطه(ترون)	رابطه	سیالی
روک	روک	روک	روک	جَلّ

رومال	رومال	رومال	رومال	دزپاک
روانگی	روانگی	روانکی	روانگی	ریادَگی
روایت	روایت	روایت	روایت	حدیث
روٹی	مانی	روتئ	روٹی	نان
زاویہ	زاویو	زاویہ	زادیہ	گونمب
زبانی	زبانی	زبانی	زبانی	زبانی
زبردست	زبردست	زبردست	زبردست (ڈاھڑا)	زبردست
زمین	زمین	زمکہ	زمین	زمین
زمیندار	زمیندار	زمیدار	زمیندار	زمیندار
سادگی	سادگی	سادکی	سادگی	سادگی
ساز	ساز	ساز	ساز	ساز
سازش	سازش	سازش	سازش	سازش
ساقی	ساقی	ساقی	ساقی	ساقی
سالانہ	سالانو	سالانہ	سلانہ	سالینہ
شک	شک	شک	شک	شک
شکل	شکل	شکل	شکل	شکل
شکریہ	شکریو	شکریہ	شکریہ	مِنّت
شہر	شھر	بنار	شہر	شھر

شیخ	شیخ	شیخ	شیخ	شیخ
صاف	صاف	صفا	صاف	صفا
صبا	صبا	صبا	صبا	سمیر
صبر	صبر	صبر	صبر	صبر
صحبت	صحبت	صحبت	صحبت	یکجائی
صف	صف	صف	صف	سرپ
ضروری	ضروری	ضروری	ضروری	اَلّمی
ضلع	ضلعو	ضلع	ضلع	ضلع
ضمانت	ضمانت	ضمانت	ضمانت	مانذمانی
ضِمنی	ضّمنی	ضمنی	ضمنی	بازونی
ضمیر	ضمیر	ضمیر	ضمیر	زِرد
طالب	طالب	طالب	طالب	لوٹوک
طاقت	طاقت	طاقت	طاقت	ھائی
طبیعت	طبیعت	طبیعت	طبیعت	تب
طریقہ	طریقو	طریقہ	طریقہ	وڈ
طوق	طوق	طوق	طوق	طوق
ظالم	ظالم	ظالم	ظالم	ظالم
ظاہر	ظاھر	ظاھر	ظاہرا	سِھرا
ظاہردار	ظاھردار	ظاہردار	ظاہردار	ظاھردار

ظلم	ظلم (ژاد)	ظلم	ظلم	ظلم
عابد	عابد	عابد	عابد	عبادت کنوخ
عاجز	عاجز	عاجز	عاجز	ایرمان
عاق	عاق	عاق	عاق	عاق
عبادت	عبادت	عبادت	عبادت	عبادت (ذکر)
عبارت	عبارت	عبارت	عبارت	نوشتہ
عدد	عدد	عدد	عدد	حساب
عرض	عرض	عرض	عرض	دزبندی
غار	چُرغار	غار	غار	گار
غائب	غائب	غائب	غیب	چیر
غرض	غرض	غرض	غرض (لوڑ)	مطلب
غرق	غرق	غرق	غرق	گرک
غم	غم	غم	غم	گم
فاتحہ	فاتحہ	فاتحہ (پاتا)	فاتحہ	پاتیا
فرمان	فرمان	فرمان (حکم)	فرمان (حُکم)	پرمان
قابل	قابل	قابل	قابل (لائق)	لائخ
قابو	قابو	تابو	قابو	تابو
قادر	قادر	قادر	قادر	قادر

قاصد	قاصد	قاصد(دیباد)	قاصد	قاصد
قبا	قبا	قبا	قبا	قبا
کاروان	کاروان	کاروان	کاروان	کاروان
کاکا	کاکو	کاکا	کاکا	لالہ
گرم	گرم	کرم	گرم	گرم
گُلشن	گُلشن	گُلشن	گلزار	باگ
گور	قبر	قبر	گور	گور
لاچار	لاچار	لاچار(بےوس)	لچار	لاچار
لاکھ	لَک	لَک	لَکھ	لَکھ
لالا	لالا	لالا	لالا	لالا
لامکان	لامکان	لامکان	لامکان	لامکان(بے بندر)
ماتحت	ماتحت	ماتحت	ماتحت	ماتحت
ماچس	ماچس	ماچس	ماچس	ماچس
ماحول	ماحول	ماحول	ماحول	چاگرد
ماضی	ماضی	ماضی	ماضی	گوستگین
نا	نہ	نہ	نا	نا
ناحق	ناحق	ناحق	ناحق	ناحق
ناچاقی	ناچاقی	ناچاقی	نچاقی	ناتپاکی

ناروا	ناروا	ناروا	ناروا	ناروا
ناز	ناز	ناز	ناز	ناز
واپسی	واپسی	واپسی	واپسی	واتری
واجب	واجب	واجب	واجب	واجب
وارث	وارث	وارث	وارث	وارث
واقعی	واقعی	واقعی	واقعی	جاھی
وطن	وطن	وطن	وطن	وطن
ہاضمہ	ھاضمو	ھاضمہ	ہاضمہ	ھاضمہ
ہاکی	ھاکی	ھاکی	ہاکی	ھاکی
ہاں	ھا	ھو	ہاں	ہو
ہر	ھر	ھر	ہر	ھر
ہستی	ھستی	ھستی	ہستی	ھستی
یا	یا	یا	یا	یا
یادگار	یادگار	یادکار	یادگار	آدگار
یار	یار	یار	یار	یار
یخ	یخ	یخ	یخ	یخ(۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ قدیم اُردو لغت میں تمام پاکستانی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ کی موجودگی، اُردو اور پاکستانی زبانوں کے تاریخی لسانی اشتراک کی ایک روشن مثال ہے۔ بقولِ ڈاکٹر عطش درانی

''اُردو اپنے صوتیاتی، ساختیاتی، معنویاتی، قواعدی، نحوی اور لغوی اصولوں اور املا کے لحاظ سے دیگر مقامی زبانوں سے اِس حد تک مماثل اور مربوط ہے کہ بعض اوقات اِسے مادری زبان سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔(۲)

اُردو اور پاکستانی زبانوں کا باہمی تعامل اور لین دین دوطرفہ ہے۔ جہاں اُردو علاقائی زبانوں کو ثروت مند بنا رہی ہے، وہاں اُردو بھی علاقائی زبانوں کے الفاظ قبول کر رہی ہے۔ اُردو اور علاقائی زبانوں کی ترقی لازم وملزوم ہے۔ جیسے جیسے اُردو میں ترقی ہوگی، علاقائی زبانیں بھی اِس سے مستفید ہوں گی اور اِن کی بھی علمی وادبی سطح بلند ہوگی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علمی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے ایک ترقی یافتہ زبان دوسری زبانوں اور بولیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک سرکاری اور دفتری زبان ملک کی دیگر زبانوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے اور وہ زبانیں نئے حالات کے مطابق تغیر کے عمل سے گزر کر نئی شکل اختیار کرتی ہیں، جس طرح سنسکرت نے ہندوستان کی ساری بولیوں کو متأثر کیا۔ پھر فارسی نے اپ بھرنشوں کو نئی شکل دی۔ انگریزی نے بھی ہماری زبانوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ اِسی طرح اُردو بھی ہماری مقامی زبانوں اور بولیوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ بقولِ ڈاکٹر گیان چند:

''معیاری بولی کی زندگی کی شرط یہی ہے کہ وہ بولیوں کی طرف سے مغائرت نہ برتے اور ان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرتی رہے، ورنہ سنسکرت کی طرح قواعد زدہ ہو کر ٹھٹھر جائے گی۔ معیاری زبان اس ندی کی طرح ہے، جس کی سطح کے اوپر برف کی منجمد تہہ جمی ہو، لیکن اس کے نیچے موجِ تہہ نشین مچل رہی ہو۔ یہ امواج تہہ نشین بولیاں ہیں''۔(۳)

اُردو کا پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں سے گہرا رشتہ ہے، جو محض فکری وثقافتی ہی

نہیں، بلکہ لسانی اور ساختیاتی ہے۔ اِسی لیے تو ہر علاقے نے اپنی زبان سے اُردو کی گہری مماثلت واشتراک کے سبب اپنے علاقے کو اُردو کا مؤلد ومسکن قرار دیا ہے۔ اگر چہ اِن سب دعووں کو بیک وقت درست قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن ہر علاقے کا اُردو کو اپنی زبان قرار دینا اُردو سے اس کی محبت کی دلیل ہے، جو مستقبل میں پاکستانی قوم کے اتحاد کے لیے نیک شگون ہے۔ بقولِ مولوی عبدالحق:

''یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اِس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا''۔(۴)

اردو کی لامرکزیت کی وجہ سے اس کے خلاف شر پسند عناصر علاقائی تعصّبات کو ہوا دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ بقولِ ڈاکٹر سید عبداللہ:

''بعض لوگ اُردو کی اس غیر معمولی حیثیت کو اس کی قومی حیثیت کے خلاف ایک دلیل بناتے ہیں، مگر میرے نزدیک اُردو کی سب سے بڑی فضیلت بھی یہی ہے کہ وہ کسی ایک علاقے کی زبان نہیں، بلکہ ایک لحاظ سے ہر علاقے کی زبان ہے، کیونکہ اس کا کسی علاقے کی زبان سے تعارض نہیں۔ تاریخی اعتبار سے اُردو ہی دراصل پوری قوم اور پورے پاکستان، بلکہ ایک حد تک پورے ہندوستان کی زبان ہے اور پاکستانی قومیت کی تاریخ کی واحد ترجمان تو اُردو اور صرف اُردو ہی ہے''۔(۵)

پاکستان میں علاقائی زبانوں اور اُردو کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں، بلکہ اُردو نے پاکستانی ثقافت اور تہذیبی روایت کو ایک مشترکہ بنیاد فراہم کی ہے اور لسانی مرکزیت اور نظریاتی وحدت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں:

''اُردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون؛ایک ہی رنگ ونسل؛ایک ہی آسمان؛ایک ہی زمین؛ایک اندازِفکر اور ایک طرزِ ادا کا رشتہ ہے۔دورِحاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سراغ لگاتے چلے جایئے، یہ رشتے پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے۔صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اُردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف ورقیب نہیں، بلکہ عزیز ورفیق ہیں''۔(٦)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''پاکستان کی موجودہ علاقائی زبانوں میں مطالب ومضامین میں بھی نمایاں یکسانی ہے۔ اِن میں عربی وفارسی الفاظ،علمی صوفیانہ مصطلحات،سوچ کا روحانی رخ سب میں یکساں ہے''۔(٧)

حقیقت یہ ہے کہ اُردو اور پاکستانی زبانیں ایک ہی قسم کے تاریخی،تہذیبی اور جغرافیائی ماحول میں پروان چڑھی ہیں۔ضرورت اِس امر کی ہے کہ لسانی اشتراک کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کر کے اُردو اور تمام علاقائی زبانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جائے۔اِن کے فطری اشتراک کو مزید اُجاگر کیا جائے،تاکہ قومی یکجہتی اور مفاہمت کی فضا کو فروغ حاصل ہو اور ایسی اُردو تشکیل پذیر ہو،جس میں تمام پاکستانی زبانیں بھی گھل مل جائیں اور اُردو کی اپنی انفرادی حیثیت اور شناخت بھی برقرار رہے۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اِس پہلو کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔تمام یونیورسٹیوں میں مطالعۂ پاکستان کے شعبہ جات اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں پاکستانی زبانوں کا شعبہ اِس سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے بھی علاقائی

ادب کے شاہکاروں کو اُردو میں ڈھالنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تصنیف بنیادی اُردو کے پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی اور سرائیکی میں تراجم اِس سلسلے میں مثبت اقدام ہیں۔ تقریباً تمام بڑی پاکستانی زبانوں کے اُردو کے ساتھ علاقائی روابط کے ساتھ ساتھ لسانی وتہذیبی روابط پر مقالے اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور تمام مماثلتی گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پنجابی اور اردو کے تعلق پر سب سے اہم کتاب پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کالا سنگھ بیدی نے اردو اور پنجابی کے لسانیاتی رشتہ پر تحقیقی کام کر کے دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق (پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۵۷ء) کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی۔ سندھی اور اردو کے لسانی روابط پر سید سلیمان ندوی کے مقالات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اردو سندھی کے لسانی روابط پر (سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء) پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اردو اور پشتو کے تعلق پر مولانا امتیاز علی عرشی کا مقالہ اردو میں پشتو کا حصہ خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار پراچہ نے اردو اور پشتو کے لسانی روابط کے موضوع پر (پشاور یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء) پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ایک وقیع کام ہے۔ ڈاکٹر خالد خٹک نے پی ایچ۔ ڈی کے لیے سندھی، پشتو اور اردو کے لسانی روابط (سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء) کے موضوع پر تحقیق کی۔ ڈاکٹر یوسف بخاری نے پی ایچ۔ ڈی کے لیے کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ (پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء) کے موضوع کا انتخاب کیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی نے براہوی اور اردو کا تقابلی مطالعہ (سندھ

یونیورسٹی،۱۹۷۹ء) کے موضوع پر تحقیق کی۔اسی طرح ایم فل کی سطح کے متعدد مقالے اردو اور دیگر زبانوں پر موجود ہیں،مثلاً:احمد سعید پراچہ کا ہندکو، اردو کا تقابلی مطالعہ (سندھ یونیورسٹی،۱۹۷۵ء)،احمد علی صابر بولانوی کا بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا اردو سے تقابل (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۱۹۹۹ء)،محمد اشفاق کا اردو اور پشتو میں تذکیرو تانیث (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۱ء)،کریم اللہ قریشی کا پہاڑی اور اردو کا تقابلی مطالعہ (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۲ء)، محمد اکرم کا اردو اور گوجری کا لسانی رشتہ (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۶ء)۔اِن مماثل پہلوؤں کی نشاندہی سے مزید قومی ہم آہنگی پیدا ہوگی۔عہدِ موجود میں ذرائع رسل ورسائل میں ترقی کی بدولت مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا ہے اور وہ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر مزید قریب آگئے ہیں۔ٹیلی وژن کے پروگرام بھی اِس سلسلے میں معاون ثابت ہورہے ہیں،جس سے ایک معاشرتی وحدت کا احساس اُبھر رہا ہے۔اُردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف نہیں،حلیف ہیں۔ایک کی ترقی،دوسری کی ترقی ہے۔ذاتی مفادات کی خاطر اُردو اور علاقائی زبانوں کو سامنے لا کھڑا کرنا وطنِ عزیز سے غداری کے مترادف ہے۔یہ حقیقت ہے کہ قومی زبان: قومی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔پاکستانی زبانوں اور ثقافتوں کی قربت سے پاکستانی کلچر اور تہذیب کے خدوخال مزید نکھریں گے۔

اُردو ایک تناور درخت کی مانند ہے اور علاقائی زبانوں کی حیثیت اِس کی شاخوں کی سی ہے۔شاخوں ہی سے کسی درخت کی شادابی ممکن ہے۔یا یوں کہیے کہ اُردو ایک دریا کی مانند ہے اور علاقائی زبانیں اِس میں گرنے والے دھارے ہیں۔اُردو شعر وادب میں تازگی

اورتوانائی اسی وقت آسکتی ہے، جب اس کا رشتہ مقامی ثقافت اور علاقائی زبانوں سے جوڑا جائے۔اُردو اور مقامی زبانوں میں کوئی دوئی اور عداوت نہیں۔علاقائی زبان وادب کی ترقی سے قومی زبان کی ہمہ گیری میں اضافہ ہوگا اور اس کے طرزِ اظہار میں نکھار آئے گا۔یہ بات خوش آئند ہے کہ اب اُردو تخلیقات میں علاقائی رنگ رس اور مقامی لب ولہجہ شامل ہو رہا ہے۔علاقائی زبانوں کے الفاظ ومحاورات اور پیرایۂ اظہار کی شمولیت سے اُردو کی جڑیں سرزمینِ پاکستان میں مضبوط ہو رہی ہیں۔اس کی مثالیں پاکستانی اُردو کے خدوخال/ پاکستانی اُردو مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔دوسری طرف پاکستانی زبانیں بھی اُردو جیسی بلند پایہ علمی وادبی زبان سے اکتسابِ فیض کر کے اپنا دامن وسیع کر رہی ہیں۔قومی اور علاقائی زبانوں کے یہ لسانی اور تخلیقی روابط ہماری مشترکہ قومی تہذیب کے ضامن اور قومی ادب کے نئے معمار ثابت ہوں گے۔

زبان میں تغیر زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔اگر تبدیلی کا یہ عمل رک جائے تو زبان جدید دور کے تمام احساسات وجذبات اور افکار وخیالات کے اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔یہ فطری تبدیلی زبان کا خاصہ ہے۔اِن لسانی تغیرات ہی سے زبان معاشرے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔اُردو کو اپنے تخلیقی اِرتقا کے لیے نئے خون کی ضرورت ہے، جو مقامی زبانوں کے امتزاج اور اختلاط ہی سے ممکن ہے۔اِن مقامی اور علاقائی تغیرات سے ہمیں چیں بہ چیں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اب اُردو صرف برِصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں رہی، بلکہ برِصغیر سے باہر بھی مروج ہے، مثلاً: عرب ممالک اور برطانیہ کے چند شہروں میں بھی اُردو دوسری رابطے کی زبان بن چکی ہے۔ایسے حالات میں روایتی ٹکسالی لہجے اور Dialect پر اصرار کرنا اُردو کے فطری ارتقا پر قدغن لگانے کے مترادف ہے۔لہٰذا اب ہمیں

اُردو کی وسعت اور ہمہ گیریت کے تناظر میں وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر فراخدلی سے کام لیتے ہوئے ہر لہجے اور ہر علاقائی روپ کو برداشت کرنا ہوگا، جس طرح انگریزی میں ہو رہا ہے۔ زبان: رنگ، نسل، قوم، ذات پات اور علاقے کے امتیازات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ جو اِسے اپنا لے وہی اہلِ زبان ہے، چاہے اُس کا تعلق کسی بھی نسل، علاقے اور ملک سے ہو۔ صرف صحت اور فصاحت کے ساتھ بولنا شرط ہے۔ مقامی زبانیں اُردو صوتیات پر اثر انداز ہو رہی ہیں اور اُن کے مخصوص لب و لہجے اور آوازوں کے زیر و بم سے اُردو کا تلفظ اور لہجہ متأثر ہو رہا ہے، اِس لیے پاکستانی اُردو کا لہجہ ہمارے علاقائی زبانوں کے زیرِ اثر دہلی اور لکھنؤ کے لہجے سے مختلف ہوتا جا رہا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اردو اور پاکستانی زبانوں کے ربط ضبط سے متأثر کچھ ادیبوں کی طرف سے یہ تجویز سامنے آئی کہ اردو کو پاکستانی کا نام دیا جائے۔ اس سے مزید اپنائیت کا احساس ہوگا۔ یہ تجویز چاہے کتنی خلوص پر مبنی ہو، اس میں بصیرت اور دوراندیشی کا پہلو عنقا ہے۔ اردو جیسی عالمگیر زبان کو 'پاکستانی' کا نام دینا اس کے جغرافیائی کینوس کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اردو حریمِ ایشیا سے نکل کر اب پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں اردو کی نئی بستیاں وجود میں آ چکی ہیں۔ ایسے میں اردو کو ایک مخصوص علاقائی نام دینا اس کی لسانی وسعت پر قدغن لگانے کے مترادف ہے۔ اگر اردو میں مقامی لسانی اور ثقافتی اثرات ذخیرۂ الفاظ اور لہجے میں تبدیلی آئی ہے تو یہ اس کی تحدید نہیں، وسعت کی دلیل ہے۔ انگریزی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں انگریزی مختلف لب و لہجے، تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مروج ہے۔ اسی لیے تو برٹش انگلش، امریکن انگلش، کینیڈین انگلش، انڈین انگلش اور پاکستانی انگلش جیسی

اصطلاحیں رائج ہیں، لیکن اس سے انگریزی زبان کی ترویج وترقی پر کوئی منفی اثرات نہیں پڑتے، بلکہ اسی وسعت پذیری کی وجہ سے انگریزی گلوبل ویلیج کی زبان بن چکی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُردو زبان ہم سب کی ہے اور ہم میں سے ہر شخص اہلِ زبان ہے۔ بنیادی طور پر ہم سب اہلِ زبان ہیں''۔(۸)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی بھی یہی رائے ہے کہ:

''ہر وہ شخص اُردو کا اہلِ زبان ہے، جو اُردو بولتا ہے، خواہ وہ اُسے کسی علاقائی روپ میں بولتا ہو''۔(۹)

بھارت کے برعکس پاکستان میں اُردو اور علاقائی زبانوں کا باہمی ربط ضبط زیادہ ہو رہا ہے۔ سماجی آویزش، رسم الخط کی یکسانیت اور تہذیبی پس منظر کے سبب اِس رشتے کو مزید استحکام مل رہا ہے، لیکن تغیر واصلاح کا یہ عمل پیچیدگی اور ابتری سے سادگی اور تنظیم کی طرف ہونا چاہیے، کیونکہ تمام جدید زبانیں اپنی قدیم صورت کے مقابلے میں لغت وصوت اور صرف ونحو میں سادگی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کے ربط ضبط کا سلسلہ قدرتی ہونا چاہیے، نہ کہ دانستہ طور پر مقامی زبانوں کے الفاظ ٹھونسے جائیں، جس طرح ہندوستان میں اُردو کو شُدھی بنا کر ہندی کا روپ دیا جا رہا ہے۔ کسی علاقائی تعصب یا قانونی اور سیاسی جبر کے تحت اگر مصنوعی لغت سازی کی جائے تو زبان بگڑ جاتی ہے اور اس کا پورا لسانی تشخص مجروح ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پریشان خٹک، پروفیسر(مرتب):لسانی رابطہ (اُردو،سندھی،پشتو،پنجابی اور بلوچی کے مشترک الفاظ): مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد:۱۹۸۷ء:ص۹ تا۲۰۴۔

۲۔ عطش درانی،ڈاکٹر:پاکستانی اُردو:مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد:۲۰۰۸ء:ص۱۵۔

۳۔ گیان چند جین، پروفیسر:عام لسانیات:ترقی اُردو بیورو،نئی دہلی:۱۹۸۵ء:ص۷۰۔

۴۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر(مرتب):خطباتِ عبدالحق :انجمن ترقیِ اُردو پاکستان،کراچی:۱۹۶۴ء:ص۹۵۔

۵۔ سیدعبداللہ،ڈاکٹر:مقالاتِ تدریس کانفرنس :اردومرکز،لاہور:جون ۱۹۶۴ء:ص۱۳۔

۶۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر:اُردواور پاکستانی زبانیں مشمولہ پاکستانی اُردو مرتبہ ڈاکٹرعطش درانی:مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد:ص۲۵۳۔

۷۔ سیدعبداللہ،ڈاکٹر:تحریکِ نفاذِ اُردو :مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد:۱۹۸۲ء:ص۴۰۸۔

۸۔ تحریکِ نفاذِ اُردو:ص۴۳۱و۴۳۲۔

۹۔ رؤف پاریکھ،ڈاکٹر: پاکستانی زبانیں، تحتی بولیاں اور قومی یکجہتی مطبوعہ درمجلّہ تحقیق:سندھ یونیورسٹی،جامشورو:شمارہ۱۶:۲۰۰۸ء:ص۵۹۔

باب ششم

اُردو قومی اور عالمی تناظر میں

فہرست مضامین

الف۔اردوقومی تناظر میں

(i)_ اُردو بحیثیت قومی وتہذیبی زبان

(ii)- اُردو بحیثیت رابطہ زبان

(iii)- اُردو بحیثیت علمی وادبی زبان

(iv)- اُردو بحیثیت دفتری وعدالتی زبان

(v)- اُردو بطور ذریعہ تعلیم

ب۔اُردو عالمی تناظر میں

(i)-برِاعظم ایشیا

(ii)-برِاعظم یورپ

(iii)-برِاعظم امریکہ

(iv)-برِاعظم افریقہ

الف۔اُردوقومی تناظر میں

(i)-اُردو بحیثیت قومی وتہذیبی زبان

ایک مشترکہ زبان خدا کا خاص انعام ہے، جس کے بغیر قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں زبان کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو جسم میں روح کو۔قومی زبان ہی قومی کردار اور قومی تشخص کا تعین کرتی ہے۔کسی بھی قوم کا وقار اور اس کی عظمت قومی زبان کی وجہ سے ہوتی ہے۔

زبان وادب صرف ذریعۂ اظہار وابلاغ نہیں، بلکہ یہ ایک قوم کی سماجی کیفیات کا نگار خانہ؛ مزاج کا آئینہ؛ اس کی تہذیبی سرگرمیوں کے ارتقا کا پیمانہ؛ تاریخ اور ماضی کی روایات کا خزینہ اور راہِ عمل کا مقیاس بھی ہے۔اُردو صرف اظہار وابلاغ کا ذریعہ اور عوامی رابطے کی زبان نہیں، بلکہ یہ ہماری قومی یکجہتی کی علامت،تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار؛ ہمارے ملی تشخص کی ضامن اور تاریخ کی امین اور فلسفۂ حیات کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔

کسی بھی قوم کا تصور قومی زبان کے بغیر نامکمل ہے۔قومی زبان ہی کسی ملک اور قوم کی مختلف لسانی اور علاقائی اکائیوں کو مربوط کرتی؛ ہم خیال بناتی؛ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بناتی ہے۔

اُردو پاکستان کی قومی زبان،تحریکِ پاکستان کی اساس اور ہماری اجتماعی تہذیب وثقافت کی عکاس ہے۔قومی زبان قوموں کو دل وجان سے عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنی جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کرتی ہیں۔تاریخ میں کئی مثالیں ملتی ہیں،مثلاً: جب روسی اور جرمن فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کیا تو پولی زبان کا استعمال قانوناً جرم قرار دیا گیا۔گھروں، بازاروں اور دفتروں میں پولی

زبان بولنے پر پابندی عائد کردی گئی۔اس تمام صورتِ حال کے باوجود پوری قوم نے اپنی قومی زبان کو سینے سے لگائے رکھا، کیونکہ انھیں احساس تھا کہ اگر وہ اپنی قومی زبان سے محروم ہوگئے تو بحیثیت قوم ان کا خاتمہ ہوجائے گا۔اسی طرح الجزائر پر فرانسیسیوں کا تسلط قائم ہوا تو انھوں نے فرانسیسی کو قومی زبان کی حیثیت سے رائج کرنا چاہا،لیکن تمام کوششوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود الجزائر کے باشندوں نے قومی تشخص کو عزیز رکھا اور فرانسیسی کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول نہیں کیا اور الجزائر میں عربی زبان کی قومی حیثیت برقرار رہی۔

ہر قوم اپنی زبان پر فخر کرتی ہے۔عربوں کا اپنے سوا ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہنا اور انگریزوں کا اپنے انتہائی عروج اور اقتدار کے زمانے میں شیکسپیئر کے ڈراموں کو اپنی تمام مقبوضات پر ترجیح دینا اسی فخر کا آئینہ دار ہے،مگر ہم ہیں کہ اپنی قومی زبان کے بارے میں احساسِ کمتری اور بے یقینی کا شکار ہیں۔قومی زبان کو قومی زندگی میں صحیح مقام دیے بغیر قومی یگانگت پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ ہی قوم کے دماغ سے احساسِ کمتری دور ہوسکتا ہے اور نہ خود اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے۔

گارسین دتاسی نے اِسی نکتے کی وضاحت یوں کی تھی:

''قوموں میں کوئی چیز اِس قدر اختلاف پیدا نہیں کرتی، جتنا یہ کہ اُن کی زبانیں مختلف ہیں اور کوئی چیز اتنا اتحاد و یگانگت پیدا نہیں کرتی،جتنی کہ ایک مشترک زبان''۔(۱)

بقولِ ڈاکٹر جمیل جالبی:

''پاکستان میں مضبوط اور عظیم قوم بننے کے سارے امکانات موجود ہیں۔یہ بات میری طرح آپ سب جانتے ہیں کہ قوم بننے کے لیے چار چیزیں

بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ضروری ہے کہ یہ چاروں چیزیں بیک وقت اس قوم کے اندر جاری وساری ہوں ۔ایک یہ کہ اس کا ایک جغرافیہ ہو، جس کے مقررہ حدود ہوں ۔ دوسری اس ملک میں رہنے والی آبادی کی اکثریت کا ایک مذہب ہو۔ تیسرے یہ کہ اس آبادی کی اپنی مشترک قومی تاریخ ہو اور چوتھے یہ کہ اس کی اپنی قومی زبان ہو۔ ایک ایسی قومی زبان، جسے سب بولتے اور سمجھتے ہوں اور جس کے ذریعے مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے سے ابلاغ کرتے ہوں''۔(۲)

قومی زبان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ہمارے فلسفۂ حیات کا امین اور ہمارے ملی تشخص کا آئینہ دار ہے، جس کے پس منظر میں ہماری تاریخ، روایات اور تہذیب وثقافت کی ایک داستان ہے۔ مسلمانانِ برِصغیر کو اردو سے اس لیے محبت تھی کہ اس میں ان کی بہترین ملی اور تاریخی روایات اور مذہبی وفکری رجحانات محفوظ تھے۔

کسی قوم میں اتحاد و یکجہتی ، سالمیت واستحکام، ترقی وخوشحالی کے لیے ایک قومی زبان کا کردار نہایت اہم اور کلیدی ہوتا ہے۔ جغرافیائی وحدت اور مذہب کے بعد، جو چیز ایک قوم کو ایک مرکز پر متحد رکھ سکتی ہے، وہ قومی زبان ہوتی ہے۔ قومی زبان ہی ملکی وحدت واستحکام کا ذریعہ اور ربط واتصال کا وسیلہ ہے۔ قومی زبان طرزِفکر وعمل میں مماثلت پیدا کرتی ہے۔ طرزِ فکر وعمل کی یہی مماثلت: تہذیبی وحدت اور معاشرتی یک جہتی کا سبب بنتی ہے۔ اگر ہم ایک مشترکہ پاکستانی کلچر کے متمنی ہیں تو اس کے لیے قومی زبان ہی بہترین وسیلہ ہے، کیونکہ زبان ایسا سماجی عمل ہے، جس میں پورا کلچر سانس لیتا ہے۔ قومی زبان ہی خیبر سے کراچی تک مختلف پس منظر کے حامل اور متنوع بولیاں بولنے والوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے۔ اُردو کے علاوہ

کسی پاکستانی زبان میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں اور کوئی زبان علمی وادبی لحاظ سے اس مرتبے پر فائز نہیں کہ وہ داخلی اور خارجی مسائل کے حل میں معاون ہو سکے۔قومی زبان کی تشکیل چند برسوں کا کام نہیں، بلکہ ہمارے بزرگوں کے سیکڑوں برس کی فکری کاوشوں اور تخلیقی تجربات کا ثمر ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے ایک ملک گیر اور قومی زبان کے لیے چند شرائط لازم قرار دی ہیں۔

”۱۔ وہ زبان دیسی ہو، بدیسی نہ ہو۔
۲۔ کسی فرقے یا رقبے تک محدود نہ ہو۔
۳۔ ملک کے بہت بڑے حصے میں سمجھی اور بولی جاتی ہو۔
۴۔ ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔
۵۔ ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہو۔
۶۔ زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے“
(۳)۔

مندرجہ بالا شرائط کے پیمانے پر اُردو کو جانچا جائے تو بلاشبہ ایک قومی زبان کی خصوصیات اُردو میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہ سارے پاکستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمان ہے۔ حال و مستقبل کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور عالمی تناظر میں ایک معتبر مقام کی حامل ہے۔

قیامِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان میں اُردو کا کردار اظہر من الشّمس ہے۔قصرِ پاکستان کی پہلی اینٹ ہی اُردو نے رکھی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں اُردو ہندی تنازع ہی پاکستان کی بنیاد بنا۔

مولوی عبدالحق کے مطابق:

''بالکل صحیح اور تاریخی واقعہ ہے کہ محض اُردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہوگئیں اور اُس وقت دوقومی نظریے کی بنیاد پڑی''۔(۴)

نظریۂ پاکستان کے دو اہم عناصر ہیں: ایک اسلام اور دوسرا اُردو۔

نظریۂ پاکستان کا تحفظ: نفاذِ اسلام اور نفاذِ اُردو سے ممکن ہے اور نفاذِ اسلام کے ساتھ اُردو کا تحفظ اور فروغ: پاکستان کی بقا اور ترقی کا ضامن ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اردو زبان نے مسلمانانِ برِصغیر کو مربوط اور متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اُردو برِصغیر کے تمام مسلمانوں کی مادری زبان نہ تھی، لیکن یہ اُن کے ملی تشخص کی علامت اور ترجمان ضرور تھی اور اس کے ذریعے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے اور اپنے دل کی آواز ایک دوسرے تک پہنچاتے تھے۔

چونکہ اُردو کو آغاز ہی سے مسلمانانِ برِصغیر نے اپنے ملی تشخص کی علامت سمجھ کر اپنا لیا، اِس لیے یہ اُن کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ اِس حقیقت کی ایک جھلک ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مقالے تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے، جس کی بنیاد سر سید احمد خان نے ۱۸۸۶ء میں رکھی، ۱۸۸۶ء سے ۱۹۳۸ء تک اُردو کی ترویج و ترقی اور اسے سرکاری زبان بنانے کے لیے اپنے اُنیس سالانہ جلسوں میں سینتیس قراردادیں منظور کیں، جو ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں۔(۵)

اِن قراردادوں سے قومی زبان اُردو کی اہمیت اور ضرورت واضح ہوتی ہے، نیز ہمارے اکابرین کی مساعی جمیلہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جو انھوں نے تحفظِ اُردو اور فروغِ اُردو کے لیے کیں۔ اگر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب

بھی اُردو کے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہوا تو مسلم لیگی راہنماؤں نے بڑھ چڑھ کر اِس کا دفاع کیا۔ بلاشبہ مسلم لیگ اور اُردو ہر قدم پر لازم وملزوم رہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۰۶ء تا ۱۹۴۷ء اپنے سالانہ جلسوں میں اُردو کے تحفظ ونفاذ کی خاطر نو قراردادیں منظور کیں۔(۲)

اِن قراردادوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے سارے سفر میں اُردو دوش بدوش رہی، تا آنکہ ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو نئی مملکت معرضِ وجود میں آ گئی۔ مسلم لیگ کی تمام انتخابی مہم اور تقاریر کا ذریعہ اُردو زبان ہی تھی۔ تحریکِ پاکستان کا سارا لٹریچر بھی اُردو زبان میں تھا۔ مسلم لیگ کا ترجمان روزنامہ منشور دہلی اور دوسرے تحریکی اخبار، مثلاً: زمیندار، احسان، نوائے وقت، شہباز، وحدت، سیاست اور پاکستان کا ذریعۂ ابلاغ اُردو زبان ہی تھی۔ مختصر یہ کہ تحریکِ آزادی ہو یا تحریکِ پاکستان: پیغام کے ابلاغ اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ اُردو ہی رہی۔ بحیثیتِ قوم یہ ہماری احسان فراموشی اور بے حسی ہے کہ ۷۲ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اُردو اپنے اصل مقام اور جائز حیثیت سے محروم ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد جس طرح دوسرے بنیادی نظریات سے انحراف اور اعلیٰ ترین مقاصد سے صرفِ نظر کیا گیا، اسی طرح اُردو بھی ہماری لاپروائی، غفلت اور سرد مہری کا شکار ہو گئی اور ہم نے قومی زبان کو اپنی قومی زندگی میں اس طرح داخل نہیں کیا، جس سے ہم تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی سطح پر یکجہتی کے رشتے میں پیوست ہوتے۔ اگر قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کو اس کا جائز مقام دے دیا جاتا تو آج یہ علاقائی مسائل اور لسانی جھگڑے نہ ہوتے۔ اگر ہمیں قومی مسائل کو قومی تقاضوں کے مطابق حل کرنا ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ قومی زبان کو اس کا جائز مقام دے کر اسے زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کیا جائے، تاکہ پوری قوم آزادی کی نعمت اور اس کے فیوض وبرکات سے مستفید ہو سکے۔

(ii)- اُردو بحیثیت رابطہ زبان

قومیت کے عناصر میں ایک اہم جزو رابطے کی زبان ہے۔ یہ مرتبہ کسی ملک اور قوم کی قومی زبان ہی کو زیب دیتا ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبے بشمول کشمیر اور گلگت بلتستان اُردو کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے تمام حصوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کے عوامل میں مذہب اور ثقافت کے ساتھ ایک مؤثر ترین عامل اُردو زبان ہے، کیونکہ قومی یکجہتی عوامی رابطے سے مستحکم ہوتی ہے اور عوامی رابطہ ترسیلِ اظہار کے بغیر ممکن نہیں اور ترسیلِ اظہار ایک ایسی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے، جسے ہر خطے کے افراد سمجھتے ہوں۔ یہ فخر و اعزاز ہماری قومی زبان اُردو کو حاصل ہے۔

ہندوستان میں اُردو کے خلاف تمام تعصّبات اور مخالفت کے باوجود اب بھی رابطے کی زبان وہاں اُردو ہی ہے۔ ایک قومی اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے
اُردو ہماری ناگزیر ضرورت ہے۔ اُردو کی جڑیں پاکستان کے تمام تہذیبی و سماجی مراکز میں پیوست ہیں، بلکہ ہر علاقے کے ماہرین نے تاریخی اور لسانی نسبت سے اُردو کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی ہے:

> ''یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا''۔(۷)

باوجود کچھ عناصر کی ریشہ دوانیوں کے اردو کے خلاف تعصب پروان نہیں چڑھ سکا۔ اردو کی یہ لامرکزیت: علاقائی ماورائیت اور آفاقیت ہی اس کی ناقابلِ تسخیر قوت ہے۔

> ''یہ اُردو کی کمزوری نہیں، اس کا سب سے مضبوط پہلو ہے کہ یہی ایک زبان

ہے،جس پر کسی علاقے یا صوبے کا ٹھپہ نہیں لگا ہے اوراس لیے یہی ایک زبان Link Language اور Lingua Franca ہوسکتی ہے‘‘۔(۸)

یہ جومفروضہ ہے کہ پاکستان کی صرف آٹھ فیصد آبادی ہی اُردو بولنے والوں پر مشتمل ہے اوراس طرح اعدادوشمار کے بل بوتے پر اُردو کے خلاف محاذ بنایا جاتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کے خلاف یہ نعرہ ہمارے تہذیبی اور ملی تشخص سے انکار ہے۔اُردو اگر اس قدر اقلیت کی زبان ہے تو مسلمانانِ برِصغیر نے اسے اپنے ملی تشخص کی زبان کیوں قرار دیا تھا ؟ اُردو کے خلاف ہندوؤں کے معاندانہ رویے کی بنا پر ہی تحریکِ پاکستان کی بنیاد پڑی۔اگر ایسے ہی سرشماری کرنی ہے تو اس لحاظ سے کیوں نہیں کرتے کہ کس زبان کو سمجھنے والے پاکستان میں سب سے زیادہ ہیں۔

پاکستان کی جغرافیائی اور لسانی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ اُردو ہی قومی سطح پر رابطے کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ ہے۔اپنی مقبولیت اور وسعت کے اعتبار سے اُردو کی حیثیت بمنزلہ مادری زبان کی ہے۔

صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے، جو ہماری بول چال، خط کتابت،تعلیم، رابطہ وابلاغ،تفہیم، دفتری معاملات،غور وفکر اور علمی وادبی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے۔اُردو ہماری ناگزیر ضرورت ہے اور جب تک اُردو کو قومی سطح پر ترقی نہیں دیں گے، ہماری زندگی کے ہر شعبے کی ترقی محدود اور مسدور ہوکر رہ جائے گی۔

یہی زبان ہے، جو پاکستان کے چاروں صوبوں سمیت کشمیر، گلگت بلتستان اور شمالی علاقہ جات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ہماری گلیوں، بازاروں، دیہاتوں اور شہروں میں عوام

اسی کے ذریعے اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ پاکستان کے کسی بھی علاقے میں جائیں اور کسی بھی شخص سے اُردو میں بات کریں، چاہے وہ اَن پڑھ ہو یا پڑھا لکھا ہو، آپ کی بات سمجھ جائے گا اور اُردو میں اپنا مافی الضمیر بھی بیان کرے گا۔ یہی چیز اس کی رابطہ زبان ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ عوامی رابطے کی زبان وہی ہو سکتی ہے، جو ہر علاقے اور ہر طبقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔

گارسین دتاسی اور گلکرسٹ جیسے یورپی مصنّفین اور گاندھی بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس زبان کو برِصغیر میں لینگوافرینکا کی حیثیت حاصل ہے۔ خود یورپی مصنّفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اٹھارھویں صدی ہی میں سارے برِصغیر میں اُردو کو قومی اور عام زبان (لینگوافرینکا) کی حیثیت حاصل تھی۔ فورٹ ولیم کالج (آغاز: ۴؍مئی ۱۸۰۰ء) کلکتے میں اس کی تدریس اس حقیقت کی غماز ہے۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو اگرچہ اُردو کم عمر زبان ہے، لیکن ابتدا ہی سے اس کو رابطے کی زبان ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ مغلوں کے دور میں فارسی دفتری اور تعلیمی زبان ہونے کی وجہ سے شرفا کی محافل اور مجالس میں مستعمل رہی، لیکن رابطہ زبان کا منصب حاصل نہ کر سکی۔ انگریزی دور میں انگریزی نے اپنی بساط بچھائی اور باوجود دفتری، تعلیمی اور جدید دنیا کی زبان ہونے کے، عوامی رابطے کی زبان نہ بن سکی۔ اگرچہ محض تعصب کی بنا پر ہندی کو مقابلے میں لایا گیا اور تقسیمِ ہند کے بعد ہندی، ہندوستان کی قومی زبان بن گئی، لیکن اب بھی بھارت میں روزمرہ زندگی میں سنسکرت زدہ ہندی کی بجائے اُردو آمیز ہندی مستعمل ہے۔

پاکستان بننے کے بعد خطۂ پاکستان میں رابطہ زبان کا شرف اُردو ہی کو حاصل رہا اور

الحمدللہ آج بھی اس مسند پر اردو ہی براجمان ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کی کوئی دوسری علاقائی زبان رابطہ زبان کیوں نہ بن سکی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختلاط وارتباط کا، جو ماحول اُردو کو اپنے ارتقائی سفر کے دوران میسر ہوا، وہ کسی اور زبان کو نہ مل سکا۔ اس نے برِصغیر کی تمام علاقائی زبانوں اور بولیوں کی خوشہ چینی کی اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ دوسری طرف جہاں جہاں سے گزری، اپنی اطراف وجوانب کی زبانوں کے اثرات کو اپنے اندر جذب کیا اور اپنے اثرات دوسری زبانوں پر بھی چھوڑے۔ اس طرح جہاں اس نے دوسری زبانوں سے بہت کچھ لیا، وہاں دل کھول کر دوسری زبانوں کو بھی بہرہ ور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر علاقائی زبان کے ساتھ اس کا نہایت ہی قریبی رشتہ ہے۔

اپنے اختلاطی مزاج اور خلقی فطرت کی بنا پر یہ صحیح معنوں میں سماجی، مذہبی، علاقائی اور لسانی اتحاد کی علمبردار ہے۔ اس نے ہر گروہ؛ ہر نسل اور ہر طبقے کو لسانی وحدت کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ برِصغیر کی سرزمین اس کی جائے پیدائش ہے۔ عربی وفارسی اس کی سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔ پنجابی کا اردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ سندھی، پشتو، بلوچی بھی اس کی قرابت دار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہیں رشتہ دور کا ہے اور کہیں قریب کا۔ کسی نہ کسی سطح پر کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اسی لیے تو ہر خطۂ برِصغیر اُردو کی جائے پیدائش ہونے کا دعویدار ہے۔ اسی ہمہ گیر تعلق کے سبب یہ ہندوپاک کے تمام علاقوں میں رابطے اور ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ یہ اپنی پیدائش کے روزِ اوّل ہی سے رابطے کی زبان (Lingue Franca) تھی، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو یا نہ ہو۔ یہ بات طے ہے کہ اُردو عوامی رابطے کی زبان ہے اور اس کی اس اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ سیاسی بنیادوں پر

اُردو کی مخالفت کرتے ہیں، وہ بھی اپنا ماضی الضمیر اُردو میں بیان کرنے پر مجبور ہیں۔

پاکستان جیسے کثیر اللسان ملک میں جملہ زبانیں اور بولیاں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ چنانچہ ہماری مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی کہ ہم بین الصوبائی اور بین العلاقائی رابطوں کے لیے اُردو استعمال کریں اور یہ استعمال ہم آج سے نہیں، بلکہ شروع دن سے بغیر کسی دباؤ اور شعوری کوشش کے کرتے چلے آرہے ہیں۔ حصولِ پاکستان کی تحریک ہو یا موجودہ دور میں عوامی انتخابات، قومی سطح کے نمائندوں کو جب بھی عوام سے مکالمے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے، اُردو ہی آگے بڑھ کر ابلاغ کا مسئلہ حل کرتی ہے۔

ایک بلوچی اپنی بلوچی زبان میں اگر پنجابی سے بات کرے تو وہ اس کے خیالات سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس طرح پشتو بولنے والے کی گفتگو سندھی کے لیے سمجھنا مشکل ہے۔ دیگر زبانوں کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ ایسی صورت میں ایک علاقے کے لوگوں کو دوسرے خطے کے لوگوں کے ساتھ میل جول، تبادلۂ خیال اور باہم ربط ضبط کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مشترکہ زبان ہو، جو ذریعۂ اظہار بنے۔ صوبائی اور جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر دل و دماغ کو جوڑے۔ ایسی زبان، جو پشاور سے کراچی تک اور مکران کے ساحلوں سے لے کر شمالی علاقہ جات کے دور دراز پہاڑی سلسلوں تک، ہر جگہ اور ہر سطح پر استعمال ہو سکتی ہو اور جسے ہر علاقے کا فرد یکساں استعداد سے بول اور سمجھ سکتا ہو۔ بلاشبہ وہ زبان اردو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

(iii)- اُردو بحیثیت علمی و ادبی زبان

اُردو کو علمی و ادبی حیثیت حاصل کیے صدیاں بیت چکی ہیں۔ قلی قطب شاہ کا دیوان

اورمعراج العاشقین جیسے کئی شعری اورنثری شاہکاراس حقیقت کا ثبوت ہیں ۔ادبی لحاظ سے اُردو انتہائی بااثر اور ترقی یافتہ زبان بن چکی ہے ۔نہ صرف یہ کہ اس کا کلاسیکی ادبی ذخیرہ نہایت وسیع اور وقیع ہے، بلکہ جدید ترین ادبی تجربات بھی اُردو میں کامیاب رہے ہیں ۔اُردو نظم میں: غزل،قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، حمد،نعت، ہجو، شہرآشوب، سانیٹ، ہائیکو، رباعی، قطعہ، گیت غرضیکہ ہرقسم کی ہیئت اور ہرقسم کے موضوع پرلکھا گیا ہے۔

اُردونثر میں: داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنزومزاح، آپ بیتی، سوانح عمری، انشائیہ، مضمون، مقالہ، خاکہ، رپوتاژ، انٹرویو، تنقید وتحقیق جیسے موضوعات پر خاصا ادب وجود میں آچکا ہے۔ ولی، میر، غالب، اقبال جیسے شعرااور سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیراحمد جیسے ادبا نے اُردو کا دامن مالا مال کردیا ہے۔اُردو نے مقدور بھر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے خوشہ چینی کر کے اپنا دامن جواہر پاروں سے بھرلیا ہے اوراس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اب اُردو سے ان ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمے کیے جاتے ہیں۔اگرچہ یہ کم عمر زبان ہے،لیکن ادبی حیثیت سے اس کا پلہ دنیا کی سیکڑوں زبانوں پر بھاری ہے۔اُردو میں سیکڑوں لغات اور متعدد شعبہ جات سے متعلق انسائیکلوپیڈیا زمرتب ہوچکے ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان کی کتـابیـات لِغـاتِ اُردو سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے ۔اب تو آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر اُردولغت بورڈ ۲۲ جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان اُردو لـغـت (تاریخی اصول پر) مرتب کر چکا ہے، جوقریباً چارلاکھ الفاظ پر مشتمل ہے۔علمی اور سائنسی لحاظ سے بھی اُردو لائقِ تحسین مقام تک پہنچ چکی ہے۔ترجمے کی ضروریات کے مطابق: عربی، فارسی اور انگریزی، ہرقسم کے موضوع سے متعلق لاکھوں کی تعداد میں اصطلاحات وجود میں آچکی ہیں ۔اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی مجلسِ ترجمہ کے قیام سے

لے کر اب تک مسلسل اس نہج پر کام جاری ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، مرکزی اُردو بورڈ، مجلس دفتری زبان، مقتدرہ قومی زبان اور ترقی اُردو بیورو ہندوستان کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ اِن اصطلاحات کی بدولت ہر مضمون کی کتب اُردو میں آسانی سے ترجمہ کی جاسکتی ہیں۔قیامِ پاکستان سے قبل دہلی کالج، عثمانیہ یونیورسٹی، طبیہ کالج آگرہ، انجینئرنگ کالج رڑکی، سماجی اور سائنسی دونوں طرح کے علوم میں ہمارے لیے باعثِ تقلید مثالیں موجود ہیں۔حال میں وفاقی اُردو یونیورسٹی اِس کی زندہ مثال ہے۔

کسی ترقی یافتہ علمی وادبی زبان کا یہ بھی طرۂ امتیاز ہوتا ہے کہ اِس میں دیگر زبانوں کے علمی وادبی شاہکار کے تراجم اور شرحیں موجود ہوں۔اِس میدان میں بھی اُردو کسی سے پیچھے نہیں۔اس میں دنیا کی تمام مشہور کتب کے تراجم موجود ہیں۔مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ کتابیاتِ تراجم میں اس کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

گذشتہ نصف صدی میں اُردو نے ہر میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔سائنسی کتب کے تراجم ہوں یا قانونی وسائنسی اصطلاحات، ہر قسم کا سرمایہ کثرت سے موجود ہے۔

اُردو میں سائنسی کتب ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ انتظام ایک علمی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں کم وبیش ساڑھے تین ہزار کتابیں میزوں پر سجائی گئی تھیں۔ان کتابوں کی فہرست سید عبداللہ نے مرتب کی تھی اور مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی نے اسے شائع کیا تھا۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی سائنسی ادب کا اشاریہ نامی کتاب میں ۱۶۰۰ اعلیٰ سائنسی کتب کی فہرست مرتب کی تھی۔اُردو سائنس کالج کی لائبریری میں سائنسی کتابوں کا تخمینہ قریباً پندرہ سے بیس ہزار ہے۔مقتدرہ قومی زبان کی

شائع کردہ کتابیاتِ درسی کتبِ سائنس میں کتابوں کی ایک بڑی تعداد کی نشان دہی کی گئی ہے۔

کراچی یونیورسٹی، مقتدرہ قومی زبان، پنجاب یونیورسٹی لاہور، مجلس ترقیِ ادب لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، اُردو اکیڈمی بہاولپور جیسے اداروں نے اُردو میں سائنسی ڈکشنریاں بھی شائع کیں۔۱۹۸۵ء تک ان ڈکشنریوں کی تعداد ۱۶ تھی۔علاوہ ازیں برسوں سے متعدد سائنسی رسالے بھی شائع ہو رہے ہیں۔کمپیوٹر کے حوالے سے بھی کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ترجمے کے لیے سافٹ ویئر تیار ہو چکے ہیں۔مقتدرہ قومی زبان کا اطلاعیات کا شعبہ مسلسل مصروفِ عمل ہے۔اُردو میں قوانین کی ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔صرف مقتدرہ ہی نے عدالتی طریقوں، قوانین اور اصطلاحات پر خاصی کتابیں شائع کی ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی ایک عرصے تک حیدر آباد دکن، بہاولپور اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں اُردو دفتری و تعلیمی زبان کے ساتھ عدالتی زبان رہی ہے۔پاکستان میں اب بھی ضلعی سطح تک اُردو دفتروں، پولیس، محکمہ مال اور عدالتوں میں رائج ہے۔جامعہ عثمانیہ میں قیامِ پاکستان سے قبل ایل ایل بی، ایل ایل ایم کی تعلیم اور ایل ایل ڈی کی تحقیق اور مقالے اُردو میں پیش ہوتے رہے۔اب کراچی یونیورسٹی اور ایک حد تک پنجاب یونیورسٹی میں بھی قانون کے امتحانات میں اُردو کے استعمال کی اجازت ہے۔بقولِ چودھری احمد خان (علیگ):

> ''ایک محتاط اندازے کے مطابق اُردو کتب قانون و رسائل کی تعداد سات ہزار سے زائد ہے۔جس میں دس لاکھ سے زیادہ صفحات ہیں''۔(۹)

یہ بیان جس کتاب میں درج ہے، وہ ۱۹۹۶ء میں طبع ہوئی۔ اب ۲۳ سال گزر جانے کے بعد نہ جانے کتنا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان کی طبع شدہ فہرست اُردو کتبِ قانون مرتبہ ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن، الفہرست مرتبہ سجاد بیگ اور قاموس الکتب ، کتابیاتِ قانون مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد اِس حقیقت کی غماز ہیں۔ بیسیوں قانونی لغات بھی شائع ہو چکی ہیں۔

اُردو اخبارات اور رسائل کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ پاکستان کے اُردو اخبارات ورسائل (کتابیات) مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری (مطبوعہ از مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد) کے مطالعے سے اُردو اخبارات ورسائل کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، جسے دو جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے اور جس میں ۲۸۰۵، اخبارات ورسائل کا ذکر ہے۔

اُردو کے موجودہ علمی وادبی، تاریخی، مذہبی ومعاشرتی سرمائے کو احساسِ تفاخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں، جس میں وقیع تصانیف نہ ہوں۔ اِس قدر کثیر ذخیرہ ہے کہ فہرست تیار کرنا محال ہے۔ علمی وادبی لحاظ سے اُردو زبان ایک بلند مقام پر پہنچ چکی ہے۔ کوئی فکر، تصور، مقصد، نظریہ، علم اور فن ایسا نہیں، جس کے اظہار سے اُردو زبان قاصر ہو۔

(iv)- اُردو بحیثیت دفتری وعدالتی زبان

کسی بھی زبان میں سرکاری اور دفتری زبان بننے کے لیے دو بنیادی شرائط کا پایا جانا لازم ہے۔

ایک یہ کہ دفاتر کے اہل کار، جس زبان میں سہولت کے ساتھ شذرہ نویسی اور مسودہ

نگاری کر سکتے ہوں اور دوسرا یہ کہ عوام کی اکثریت اس کو سمجھتی ہو۔

پاکستان میں اُردو ہی وہ زبان ہے، جو پورے ملک کی قومی اور رابطہ زبان ہونے کی حیثیت سے ان شرائط پر پورا اُترتی ہے۔

اُردو کو نہ صرف پاکستان، بلکہ پورے برِصغیر میں لینگوا فرینکا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو پاک و ہند میں مختلف ادوار میں متعدد علاقوں میں سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر مستعمل رہی ہے۔

بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے متعدد مواقع پر اُردو زبان کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا۔ تاریخی لحاظ سے دیکھیں تو اس سلسلے میں چار فرمودات ملتے ہیں:

پہلا: ۱۹۴۲ء میں

دوسرا: ۱۰۔ اپریل ۱۹۴۶

تیسرا: ۲۱۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں

اور چوتھا: ۲۴۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں۔

پہلا بیان قائداعظم نے ۱۹۴۲ میں کتاب پاکستان مسلم انڈیا کے دیباچہ میں تحریر کیا تھا:

> ''جہاں تک زبان کا تعلق ہے، پاکستان کی سرکاری زبان اُردو، فارسی رسم الخط میں ہوگی''۔(۱۰)

دوسرا ارشاد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ۱۰۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو فرمایا:

> ''میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی''۔(۱۱)

تیسرا ارشاد ڈھاکے میں ۲۱۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو منعقدہ ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے

ہوئے فرمایا:

''میں آپ کو صاف صاف بتادوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے، اِس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر غلط یا پریشان کُن اثر پڑنے والا ہے۔ بالآخر اِس صوبے کے لوگوں ہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اِس صوبے کی زبان کیا ہوگی، لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور صرف اُردو اور اُردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی کام کرسکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے، وہ اُردو ہوگی'' (۱۲)۔

چوتھا بیان ۲۴۔ مارچ ۱۹۴۸ء کا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی تقریبِ تقسیمِ اسناد سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہوکر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اُردو اور صرف اُردو ہے''۔ (۱۳)

پاکستان کے تینوں دساتیر میں اُردو کو بطور قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۹۵۶ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۱۴ میں

۱۹۶۲ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۱۵ میں

اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے مطابق

۱۹۵۶ء کے آئین میں قرار پایا تھا کہ آئین کے نفاذ کے بیس سال بعد، یعنی ۱۹۷۶ء سے ملک میں سرکاری زبان کے طور پر اُردو کا نفاذ عمل میں آئے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بیس سال تک آئینی طور پر انگریزی کو تحفظ دے دیا گیا۔ یہی نہیں، بلکہ یہ طے پایا کہ اس آئین کے نفاذ سے دس سال بعد، یعنی ۱۹۶۶ء میں ایک کمیشن قائم کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں آئین کے دس سال بعد تک اُردو کے زبانِ دفتری کے طور پر نفاذ کے سلسلے میں ذکر و فکر تک کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس آئین پر عمل درآمد ہونے سے پہلے ہی اس کو منسوخ کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۹۶۲ء کا آئین آیا اور اس میں انگریزی کو پندرہ سال کے لیے تحفظ دیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ ۱۹۶۲ء سے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال بعد ملک میں اُردو کو دفتری زبان کی حیثیت دی جا سکے گی، یعنی اس نظامِ کار کے مطابق اُردو کا نفاذ ۱۹۷۷ء سے ہونا تھا، مگر حکومتوں کے ردو بدل، مارشل لا کے نفاذ اور آئین کی منسوخی کی وجہ سے اُردو کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء کا آئین آیا اور اِس میں انگریزی کو ۱۹۸۸ء تک تحفظ دیا گیا۔ اِس میں کہا گیا کہ ۱۹۸۸ء تک اُردو کے نفاذ کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ اس آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء تک اُردو کا نفاذ ہو جانا چاہیے تھا، مگر تمام ذرائع اور وسائل میسر ہونے کے باوجود اس اہم ترین اور قومی فریضے کی بجا آوری سے مسلسل انحراف کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ مقتدرہ قومی زبان نے اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے انتظامات ۱۴۔ اگست ۱۹۸۸ء تک کر لیے گئے تھے۔

سرکاری دفاتر میں اُردو کی ترویج کے لیے مقتدرہ قومی زبان، مجلس زبانِ دفتری

پنجاب، مرکزی اُردو بورڈ لاہور (اُردو سائنس بورڈ) انجمن ترقیِ اُردو کراچی، اُردو لغت بورڈ کراچی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور چند دیگر اداروں نے علمی اور عملی اقدامات کیے۔

مقتدرہ قومی زبان نے جنوری ۱۹۸۰ء میں نفاذ اُردو کا تین مرحلوں پر مشتمل ایک تدریجی پروگرام پیش کیا تھا۔ اس منصوبے کی حتمی سفارشات مارچ ۱۹۸۱ء میں کابینہ ڈویژن کو ارسال کی گئیں۔ ان کے مطابق ۱۹۸۳ء تک سرکاری دفاتر میں اُردو کا نفاذ مکمل ہونا تھا۔ یہ منصوبہ ابھی تک حکومت کے زیرِ غور چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں وفاقی حکومت کے دفاتر میں کچھ کام اُردو میں کرنے کی ہدایات بھی جاری کی گئیں، لیکن ان پر پوری طرح عمل درآمد نہیں ہوا۔

مقتدرہ کا قیام ۴/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو ایک قرارداد کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس کے مقاصد میں حکومت کو نفاذِ اُردو کے لیے تجاویز پیش کرنا اور اس مقصد کے لیے ضروری مواد اور لغات وغیرہ تیار کرنا شامل تھا۔ قومی زبان کے لیے مقتدرہ نے خاطر خواہ خدمات انجام دی ہیں۔ ہزاروں صفحات کے تراجم کیے گئے۔ مجلس زبانِ دفتری کی ۳۵ ہزار اصطلاحوں پر نظر ثانی کی گئی۔ دفتری لغات شائع کیے گئے۔ دفتری مراسلت کے نمونوں اور دفتری ورکشاپس کے لیے تربیتی مواد شائع کیا گیا۔ اہلکاروں کو اردو مختصر نویسی میں تربیت کی گئی۔ دو ہزار سے زائد سرکاری اہلکاروں اور چار ہزار افسروں کی تربیت کی گئی۔ چھے اداروں کے لیے ورکشاپیں منعقد کی گئیں۔ تربیتی اداروں میں دفتری اُردو پر لیکچر دیئے گئے۔ نظم و نسق کے موضوع پر کتابیں شائع کی گئیں۔

ماضی میں اُردو زبان پورے برِصغیر میں نہ صرف باہمی رابطے اور اظہار کی زبان تھی، بلکہ دفتری، عدالتی اور کاروباری زبان بھی تھی۔ جنوبی ہند میں عادل شاہی دورِ حکومت میں

اُردو ادبی زبان کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں خود انگریزوں نے عدالتوں اور دفتروں کی زبان فارسی سے اُردو کردی۔ اُردو کم وبیش پاکستان کے اکثر علاقوں کی دفتری اور عدالتی زبان رہ چکی ہے اور یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اس لیے کہ ہر علاقے کا باشندہ اسے سمجھ اور بول سکتا ہے۔ آج بھی پاکستان میں نچلی سطح پر اُردو کا رواج عام ہے اور وہ تمام ادارے، جن کا عوام سے براہِ راست تعلق ہے، ان میں سارے دفتری امور اُردو ہی میں انجام پاتے ہیں، مثلاً: ضلعی عدالتیں، محکمۂ مال، پولیس، بلدیاتی ادارے، محکمۂ ڈاک، زراعت و تعلیم اور ضلعی سطح پر دیگر دفاتر کے بیشتر امور اُردو میں انجام پاتے ہیں۔

بلوچستان میں دفتری مراسلت کے لیے اُردو ۱۸۷۷ء سے استعمال ہونا شروع ہوئی۔ ریاست قلات میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک اُردو کا استعمال جاری رہا۔ ۴رمئی ۱۹۷۲ء کو گورنر بلوچستان کے حکم سے دفتری کاروبار اُردو میں کردیا گیا۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی نے پہلی بار ستمبر ۱۹۸۱ء میں اپنی قرارداد کے ذریعے اُردو نافذ کی۔ ریاستِ آزاد جموں کشمیر میں اُردو کا استعمال انیسویں صدی سے جاری ہے۔ ۱۹۶۷ء سے پہلے وہاں ضلعی سطح تک اُردو مروج تھی۔ ۱۴راپریل ۱۹۶۷ء کو نفاذِ اُردو کا پہلا حکم نامہ جاری ہوا۔

اُردو کے نفاذ کے سلسلے میں کچھ ترقی صدر ضیاء الحق کے دور میں ہوئی۔ تاہم مرحوم کے آخری دور میں حکومت نے بہت سے اقدام صفر کر کے پہلی سی صورت بحال کردی۔ وزیر اعظم شوکت عزیز صاحب کی قائم کردہ کابینہ کمیٹی نے یکم فروری ۲۰۰۷ء کو اپنے اہم اجلاس میں سفارشات کا جائزہ لیتے ہوئے اتفاق کیا کہ سرکاری دفاتر، عدالتی امور، مقابلے کے امتحانات اور تعلیمی اداروں میں اُردو اور انگریزی زبانیں استعمال کی جاسکتی ہیں، نیز قومی تقاریب، استقبالیوں اور قومی تہواروں کی تقاریب میں اُردو زبان کو لازمی قرار دیا، لیکن اس دور میں بھی

اردو کو دفتری زبان نہ بنایا جا سکا۔

دوسری آزاد ہونے والی اقوام نے غلامی کا یہ جوا بہت جلد اُتار پھینکا، مثلاً :عرب افریقی مما لک نے انگریزی اور فرانسیسی کی بجائے عربی ہی کو دوبارہ اپنی دفتری زبان بنالیا۔ آزاد ہوتے ہی انڈونیشیا نے ڈچ اور ملایشیا نے محض دو ہزار الفاظ پر مشتمل ملائی کو ترقی دے کر اپنی دفتری زبان بنالیا، حتیٰ کہ بنگلہ دیش نے بھی بنگالی کو دفتری زبان قرار دے دیا۔ پورے ایشیا میں صرف فلپائن، پاکستان اور بھارت تین ایسے مما لک ہیں، جنھوں نے انگریزی کو گلے لگایا ہوا ہے۔

بقولِ ڈاکٹر جمیل جالبی:

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنی ملکی مشینری کو تیز رفتاری اور صحیح رُخ پر استوار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تین میدانوں میں بہرحال فوری طور پر اُردو نافذ کرنی ہوگی۔

ایک: دفتری نظام کو اُردو میں بدلنا ہوگا۔

دو: اُردو کو تدریس کی زبان بنانا ہوگا۔

تین: مقابلے کے امتحانات کے لیے اُردو کو لازمی قرار دینا پڑے گا''۔(۱۴)

اُردو کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری افسر شاہی ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر دفتروں میں اُردو نافذ ہو جائے تو افسر شاہی کی اکثریت اپنی مہارت اور تخصیص کھو بیٹھے گی، کیونکہ انگریزی ہی سے اس کا بھرم قائم ہے۔ جب کبھی اُردو کے نفاذ کی منزل قریب آئی ہے تو اس نے مختلف حیلوں بہانوں سے روڑے اٹکائے ہیں۔ اسی طبقے نے سیاست، معیشت اور اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مذکورہ اقلیت ان افراد پر مشتمل ہے، جن کا مطمحِ نظر اپنے ہاتھوں

میں 'سیاسی اختیار' اور 'معاشی اعتبار' کو جمع کرنا ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ حکام قطعاً نہیں چاہتے کہ اُردو نافذ ہو، اس لیے کہ اگر اُردو نافذ ہوگئی تو عام لوگوں کے بچے اوران کے بچے ایک جیسے ہو جائیں گے۔ انگریزی خواہ طبقہ اس بات سے پریشان ہے کہ اُردو کو سرکاری سطح پر تسلیم کرلیا گیا تو سیاسی اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ورنہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

> ''اُردو کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے اور موجود ہے، وہ اتنا ضروری ہے کہ اس پر بڑی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے''۔(۱۵)

زندگی کے تمام شعبوں میں اردو کا نفاذ ہماری قومی ضرورت اور آئینی تقاضا ہے۔ قائد اعظم کے دوٹوک موقف اور دساتیرِ پاکستان میں اُردو کا مقام بطورِ سرکاری زبان متعین ہونے کے بعد کسی حیلے بہانے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اُردو ایک ثروت مند اور مقبول زبان ہے اور اس میں سائنسی، دفتری، کاروباری، علمی اور تہذیبی ضروریات پوری کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ نفاذِ اُردو کے ضمن میں آزاد کشمیر کی مثال کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں حکومتِ آزاد کشمیر نے اُردو کے نفاذ کا پہلا حکم نامہ جاری کیا۔ اس حکم نامے سے پہلے عملی طور پر کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ نہ اُردو ٹائپ مشینیں تھیں اور نہ تربیت یافتہ عملہ موجود تھا۔ دفتری اصطلاحات کے ترجمے مکمل ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا گیا۔ چونکہ حکومت نفاذِ اُردو کے سلسلے میں مخلص اور سنجیدہ تھی، اس لیے وہاں دفتروں میں اُردو مکمل طور پر نافذ ہوگئی اور یہ تجربہ پوری طرح کامیاب ہوا۔

انگریزی کی وجہ سے، جن مشکلات کا سامنا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب تک انگریزی دفتری زبان بنی رہے گی، قوم کا استحصال ہوتا رہے گا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جلد از جلد اُردو کو اس کا جائز مقام دیں اور اسے زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں۔ نفاذِ

اُردو سے طبقاتی نظام ختم ہوجائے گا اور ساری قوم گھٹن کی فضا سے نکل کر آزادی کی فضا میں سانس لے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس دن اُردو کا نفاذ ہوگا، اس دن ہم ذہنی وفکری طور پر آزاد ہوں گے۔

(v)- اُردو بطورِ ذریعہ تعلیم

اُردو محض شاعری، افسانے اور ناول کا ذریعۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ جدید علمی، سائنسی اور قانونی تقاضوں کو پورا کرنے والی زندہ اور ہر لحہ ترقی پذیر زبان ہے۔ یہ بیسویں صدی میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم رہ چکی ہے۔

اُردو ماضی میں ان تجربات سے گزر چکی ہے اور قومی توقعات پر پورا اُتر چکی ہے۔ ماضی میں اِس نے تعلیمی اداروں اور مذہبی درس گاہوں کی علم وفن کی ضرورتوں کو پورا کیا اور طب، انجینئرنگ اور زراعت کی درس گاہوں کی زبان بن کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد دکن میں قائم ہونے والی عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۸۴۲ء میں قائم ہونے والا دہلی کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، میڈیکل کالج آگرہ، وٹرنری کالج پونا، انجینئرنگ کالج اُردو ذریعۂ تعلیم کی روشن مثالیں ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ بیرونِ ملک بھی گئے اور کامیاب ڈاکٹر اور انجینئر ثابت ہوئے۔ دہلی کالج سے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا بیان لائقِ توجہ ہے:

> ''ایک دہلی کالج ایسا تھا، جہاں مغربی علوم، یعنی ہیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی اور باوجود ان تمام موانعات کے، جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے، وہ نہایت کامیاب رہا۔ اس کی تصدیق مسٹر کارگل، پرنسپل

دہلی کالج کے اس بیان سے ہوئی، جو ان کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۵۲ء میں درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔اس کے بعد وہ اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں، ورنہ اس کا علم اور بھی بہتر ہوتا'۔ پھر وہ لکھتے ہیں: 'حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا، جو معاملاتِ تعلیم سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علمِ ہیئت، جنرل سائنس اور اخلاقی اور مذہبی مسائل میں گفتگو کی۔ان سب کا یہ بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بڑی ترقی پائی جاتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے آثار نہیں نظر آتے''۔(۱۶)

قیامِ پاکستان کے بعد وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے سائنس و ٹیکنالوجی کا، کامیاب تجربہ ہمارے سامنے ہے۔اس کے ساتھ کراچی یونیورسٹی میں ۱۹۵۱ء سے سائنسی اور عمرانی علوم اور پنجاب یونیورسٹی میں بھی عمرانی علوم کے امتحانی پرچے اُردو میں حل کرنے کی اجازت سے نہایت مثبت نتائج برآمد ہوئے۔اِس لیے محض یہ دلیل کہ اُردو میں سائنسی کتابوں اور مواد کی کمی ہے، کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب حیدر آباد دکن میں اُردو یونیورسٹی کے درجے تک ذریعۂ تعلیم بنی تو اس وقت یہ صرف شعر و ادب اور صحافت کی زبان تھی۔اب علم و فن کی زبان بن چکی ہے۔

انجمن ترقیِ اُردو، دائرۃ المعارفِ اسلامیہ، اُردو ڈکشنری بورڈ، اُردو سائنس بورڈ، سائنٹفک

سوسائٹی پاکستان، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، مقتدرہ قومی زبان، مجلس زبانِ دفتری پنجاب، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور دوسرے کئی ادارے مسلسل تصنیف وتالیف میں مصروفِ عمل ہیں۔ اگر بڑے پیمانے پر اُردو کو سائنسی علوم کی تدریس کا ذریعہ بنایا جائے تو مارکیٹ کی ضرورت اور طلب کے لحاظ سے جلد ہی اعلیٰ سطح پر سائنسی درسی کتب مارکیٹ میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ کوئی زبان علمی زبان نہیں بن سکتی، جب تک کہ وہ اعلیٰ علوم کے لیے ذریعۂ تدریس نہ ہو۔ اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، کراچی یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، اُردو سائنس بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے بنیادی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرنے کا کافی کام ہو چکا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کام کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر رواں دواں علمی اور عملی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔

ب۔ اُردو عالمی تناظر میں

اردو اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی اور اپنے پھیلاؤ اور وسعت کے لحاظ سے بھی بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ یا ملک ایسا ہو، جہاں اُردو بولنے والے موجود نہ ہوں۔ یونیسکو کے اعداد وشمار کے مطابق چینی اور انگریزی کے بعد اُردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔

"Concise Encyclopedia بھی اسے دنیا کی بڑی زبان قرار دیتا ہے"۔(۱۷)

جدید ذرائع ابلاغ کے سبب سکڑتی ہوئی دنیا میں اُردو کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اپنے علمی، ادبی، ثقافتی، تفریحی اور تعلیمی دائروں کے ذریعے دنیا کے اہم ممالک میں ایک خاص مقام حاصل کر رہی ہے، حتیٰ کہ برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک سے اُردو خبرنامے، رسالے اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ قرآنی رسم الخط کی وجہ سے ہر خطے کے

مسلمانوں کو اس سے خاص اُنس ہے۔ لندن، برمنگھم، لاس اینجلس، نیویارک اور ٹورانٹو جیسے بڑے عالمی شہر 'اُردو نواز شہر' کہلاتے ہیں۔ برطانیہ، جرمنی، ناروے، ڈنمارک، امریکہ اور کینیڈا میں اُردو کی بیسیوں ادبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔

(i)-برِاعظم ایشیا

برِاعظم ایشیا میں سب سے پہلے جنوبی ایشیا میں اُردو کی صورتِ حال دیکھتے ہیں۔ اُردو پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، مالدیپ، سری لنکا اور بھوٹان غرض سارے سارک ممالک کے درمیان اتحاد اور ابلاغ وترسیل کا ذریعہ ہے۔ جنوبی ایشیا میں اُردو واحد زبان ہے، جسے طورخم سے چٹاگانگ اور کوہِ ہمالیہ سے جزائر مالدیپ تک قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے۔

یہ پاکستان کی قومی زبان ہے اور بطورِ رابطہ زبان اپنا فریضہ بخوبی نبھا رہی ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ ہندی قومی زبان ہے، تاہم اُردو دوسری بڑی زبان ہے، جو بھارت کے باشندوں کے درمیان ربط وابلاغ کا ذریعہ ہے۔ بھارت میں سکولوں اور مدارس کے ساتھ ساتھ متعدد یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اُردو کے شعبے موجود ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اُردو کے اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔

مقبوضہ کشمیر میں مدارس اور ذرائع ابلاغ میں ہر طرف اُردو کا چلن عام دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کشمیری زبان کے بعد اُردو ہی سب سے بڑی رابطے کی زبان ہے۔ بنگلہ دیش میں ڈھاکہ اور راجشاہی دونوں یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے موجود ہیں۔

سری لنکا اور مالدیپ میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔

ان ممالک میں قائم دینی مدارس اُردو کی ترویج اور اشاعت کا بڑا ذریعہ ہیں۔

پاکستان کے قریبی ہمسایہ ملک افغانستان کی قومی زبان فارسی ہے۔ افغانستان کے ساتھ تاریخی، لسانی، مذہبی اور ثقافتی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے اُردو اہلِ افغانستان کے

لیےاجنبی نہیں۔۱۹۷۹ء میں روسی حملے کے بعد افغان مہاجرین کی ایک بہت بڑی آبادی نے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی تعداد تیس لاکھ ہے۔غیر رجسٹرڈ اس پر مستزاد ہیں۔اس طرح مل ملا کر افغان مہاجرین کی تعداد تقریباً پچاس لاکھ ہے۔اس ہجرت کے دوران افغانوں کی ایک نسل پاکستان میں جوان ہوئی ہے۔افغانی مرد وخواتین یہاں خرید وفروخت اور کام کاج کے دوران رابطے کے لیے اُردو بولتے ہیں۔ یہاں جوان ہونے والی نسل نے تو اُردو پر حیرت انگیز طور پر عبور حاصل کرلیا ہے۔وہ اُردو بولتے ہیں۔اُردو فلمیں اور ڈرامے دیکھتے اور اُردو گانے سنتے ہیں۔اب افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد وطن واپس جا چکی ہے۔ان کے ساتھ اُردو بھی افغانستان پہنچ چکی ہے۔افغانستان کے مدارس کے طلبہ کی کثیر تعداد پاکستان سے فارغ التحصیل ہے،جن کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اس کے علاوہ کاروباری حضرات بھی اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔مستقبل میں افغانستان میں اُردو کی ترقی کے روشن امکانات ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ امن کے بعد حکومتِ پاکستان،افغانستان میں اُردو کی ترویج وترقی میں معاونت کرے
۔

جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو تعلیم دی جارہی ہے۔اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز اور ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں بھی اُردو تدریس کا انتظام ہے۔چین میں پیکنگ یونیورسٹی، پاکستان ایمبیسی کالج بیجنگ اور پیکنگ ریڈیو کا فارن لینگوئجز انسٹیٹیوٹ،اُردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔پاکستان اور چین کے درمیان ثقافتی معاہدے کے تحت چینی طلبہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں اُردو سیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ترکی کی تین یونیورسٹیوں:انقرہ،استنبول اور قونیہ میں اُردو زبان اور مطالعۂ پاکستان کے شعبے موجود ہیں۔

فارسی کواُردو کی مادرِمہرباں کہا جاتا ہے۔ برادر ملک ایران کے ساتھ ہمارے تاریخی، لسانی اور ثقافتی تعلقات ہونے کی وجہ سے اُردو ایران میں نامانوس زبان نہیں ہے۔ پاکستانی زائرین بھی اُردو کے تعارف کا بڑا ذریعہ ہیں۔۱۹۷۹ء کے انقلاب سے پہلے تک اصفہان، مشہد اور شیراز کی جامعات میں اُردو پڑھائی جاتی رہی۔ اس وقت تہران یونیورسٹی اور تہران میں پاکستانی ایمبیسی سکول میں اُردو کی تدریس جاری ہے۔

برما اور رنگون میں بھی اُردو بولنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ملائشیا میں برِصغیر کے ہندوؤں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہاں اُردو سمجھی اور بولی جاتی ہے،لیکن ہندی کے نام سے موسوم ہے،حتیٰ کے خالص اُردو فلموں کو ہندی فلموں کے نام سے دکھایا جاتا ہے۔

روس کی نوآزاد ریاستوں میں سے ازبکستان میں تاشقند کی وسط ایشیائی سرکاری یونیورسٹی میں ۱۹۴۷ء سے شعبۂ اُردو کام کر رہا ہے۔ معروف ازبک محقق انصار الدین ابراہیم کے مرتب کردہ اُردو ازبك لـغـت میں ۲۷۰۰ مشترک الفاظ پیش کیے گئے ہیں۔ ریڈیو تاشقند کی اُردو سروس بھی اُردو کے تعارف اور فروغ کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

عرب دنیا میں تو اُردو عوامی سطح پر عربی کے بعد رابطے کی زبان ہے۔ سعودی عرب، قطر، مسقط، بحرین، کویت اور متحدہ عرب امارات میں پاکستانی اور انڈین سکول کثیر تعداد میں ہیں، جہاں اُردو کی تدریس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار ادبی تنظیمیں فروغِ اُردو کے لیے کوشاں ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اُردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اُردو اخبارات اور رسائل بآسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ اُردو فلمیں اور گانے بھی بہت مقبول ہیں۔ کاروباری حضرات اور انتظامی آفیسر اُردو جانتے ہیں۔

(ii)-برِاعظم یورپ

برطانیہ میں برِصغیر پاک و ہند کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے، جن کے درمیان اُردو رابطے کا کام دیتی ہے۔بعض آبادیاں ایسی ہیں، جہاں انگریزی بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ برطانیہ میں اُردو دوسری بڑی زبان کی حیثیت سے اُبھر رہی ہے۔

> ''آج برطانیہ کو پاکستان [اور] ہندوستان کے بعد اُردو صحافت وادب کا تیسرا بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔اُردو فلمیں نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں۔ ہر سال ہزاروں بچے او لیول کا امتحان دیتے ہیں۔سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن ا سٹڈیز لندن، اُردو مرکز لندن، یونیورسٹی کالج لندن، کنگسٹن سکول لندن، انسٹیٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، برمنگھم یونیورسٹی، بریڈفورڈ کمیونٹی کالج جیسے ادارے تدریسِ اُردو کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔اس کے علاوہ متعدد اُردو تنظیمیں:اخبارات اور رسائل اُردو کی ترویج میں مصروفِ عمل ہیں''۔(۱۸)

روس میں ماسکو یونیورسٹی کا ایشیائی اور افریقی اقوام کا ادارہ، ماسکو کا بین الاقوامی تعلقات کا ادارہ اور لینن گراڈ یونیورسٹی کی شرقیاتی فیکلٹی اُردو کی تدریس کے حوالے سے معروف ہیں۔ریڈیو ماسکو کی اُردو نشریات کا اُردو کی ترویج میں اہم کردار ہے۔جرمنی کی متعدد یونیورسٹیوں میں دوسری ایشیائی زبانوں کے ساتھ اُردو کی تدریس جاری ہے۔اس کے علاوہ فرانس، ناروے، سویڈن اور اٹلی، بیلجیم، پولینڈ وغیرہ میں بھی اُردو زبان کے سرٹیفکیٹس کورسز کرائے جاتے ہیں۔

(iii)-برِاعظم امریکہ

''اُردو امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔اِن میں وسکانسن، شگاگو، ڈیوک، مشی گن، کولمبیا اور کارنل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں''۔(۱۹)

اِس کے علاوہ متعدد ادبی تنظیمیں اور فورم اُردو کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔

کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کو اُردو کا شہر کہا جاتا ہے۔اُردو میں نئی نسل کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستانی اور بھارتی نسل کے بچے کینیڈا کے تقریباً ہر شہر میں بڑے ذوق وشوق سے اُردو پڑھتے ہیں۔صرف ٹورانٹو میں اِن اُردو خواں بچوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ یونیورسٹی سطح کے اداروں میں: انسٹیٹیوٹ آف اُردو لینگویج اینڈ لٹریچر، میکگل یونیورسٹی، برٹش کولمبیا یونیورسٹی اور ٹورانٹو یونیورسٹی میں اُردو کی تدریس کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ بہت سی ادبی تنظیمیں اور فورم ترویجِ اُردو کے لیے سرگرم ہیں۔آسٹریلیا میں بھی سڈنی یونیورسٹی میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔

(iv)-براعظم افریقہ

براعظم افریقہ کے قدیم تہذیبی اور علمی اہمیت کے حامل ملک مصر میں تدریسِ اُردو کا سلسلہ ۱۹۳۹ء سے جاری ہے۔قاہرہ میں پاکستان انٹرنیشنل سکول کے علاوہ چار جامعات: الازہر، قاہرہ، عین شمس، سکندریہ میں اُردو کی تدریس ہورہی ہے۔ماریشس اور جنوبی افریقہ کے مدرسوں اور متعدد سکولوں میں اُردو کی تدریس ہورہی ہے۔(۲۰)

اُردو ہوا کے دوش پر بھی دنیا کے ہر خطے میں پہنچ رہی ہے۔ریڈیو پاکستان، اسلام آباد: جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، سعودی عرب، ایران، مصر، برطانیہ اور مغربی یورپ سمیت دنیا کے ۲۴ ممالک میں بسنے والے اُردو سامعین کے لیے روزانہ نشریات پیش کرتا ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک کے ریڈیو سٹیشن کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والے سامعین کے لیے خصوصی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان میں: بھارت، بنگلہ دیش، برطانیہ، امریکہ، فرانس، کینڈا، آسٹریلیا، جرمنی، روس، چین، جنوبی افریقہ، سری لنکا، برما، نیپال، مالدیپ، ایران، عراق، افغانستان، ترکی، عرب ممالک، ازبکستان، مصر، جاپان وغیرہ ممالک شامل ہیں۔ کئی ممالک کے ٹیلی وژن سے بھی اُردو زبان کے پروگرام دن کے کسی نہ کسی حصے میں نشر ہو رہے ہیں۔

کمپیوٹر کی دنیا میں بھی اُردو کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ یونی کوڈ کی سہولت سے اردو میں ویب سازی کے امکانات پیدا ہوئے اور اب انٹرنیٹ پر اُردو زبان و ادب کی بیسیوں ویب سائٹس موجود ہیں، جن میں اُردو زبان کی تدریس، شعر و ادب، خبر و صحافت اور خطاطی وغیرہ سے متعلق مواد شامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گارسیں دتاسی: بحوالہ قومی زبان، یکجہتی، نفاذ اور مسائل از ڈاکٹر جمیل جالبی: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۱۹۸۹ء: ص۲۔

۲۔ محولہ بالا: ص۳۲۔

۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتب): خطباتِ عبدالحق: انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، کراچی: ۱۹۶۴ء: ص۱۹۹۔

۴۔ محولہ بالا: ص۴۵۵۔

۵۔ آغاز حسین ہمدانی، ڈاکٹر (مرتب): اُردو کی قراردادیں: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: پمفلٹ نمبر ۸۹۔

۶۔ محمد اسلام نشتر: تحریکِ پاکستان اور اُردو۔ کل ہند مسلم لیگ کی اُردو قراردادیں مطبوعہ در اخبارِ اُردو: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: فروری ۲۰۰۷ء: ص۲ تا ۱۱۔

۷۔ خطباتِ عبدالحق: ص۹۵۔

۸۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: لسانی مذاکرات مرتبہ شیما مجید: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۲۰۰۶ء: ص۲۷۳۔

۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: تحریکِ نفاذ اُردو: ص۲۲۶ و ۲۲۷۔

۱۰۔ چودھری احمد خان (علیگ): اُردو سرکاری زبان: انجمن ترقیِ اُردو پنجاب، لاہور: ۱۹۹۱ء: ص۲۹۔

۱۱۔ محولہ بالا: ص۳۰۔

۱۲۔ تحریکِ نفاذ اُردو: ص۴۸۔

۱۳۔ محولہ بالا: ص۴۹۔

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: نفاذ اردو کا مسئلہ (مقالہ) مشمولہ مقالاتِ اردو

کانفرنس، خانیوال: ۱۹۸۷ء: مطلع پبلی کیشنز، خانیوال: ۱۹۸۹ء: ص ۵۸و۵۹۔

۱۵۔ قومی زبان۔ یکجہتی، نفاذ اور مسائل: ص ۳۹۔

۱۶۔ عبدالحق، مولوی ڈاکٹر: مرحوم دہلی کالج سے ایک اقتباس مطبوعہ در اخبارِ اُردو، اسلام آباد: نومبر ۱۹۸۹ء: ص ۵۔

۱۷۔ Keith Brown& Sarah Ogilive: Concise Encyclopedia of the Languages of the World: Elsevier Ltd.Oxford :2009: p1133.

۱۸۔ فیضان عارف (میزبان مذاکرہ): برطانیہ میں اردو کا مستقبل مطبوعہ در ماہنامہ اخبارِ اردو، اسلام آباد: نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۔

۱۹۔ محمد اسلام نشتر: قومی زندگی میں قومی زبان کا مقام: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۲۰۰۵ء: ص ۲۳۱۔

۲۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: انعام الحق جاوید، ڈاکٹر (مرتب): بیرونی ممالک میں اردو: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۱۹۹۶ء۔

مصنف کا تعارف

ڈاکٹر عبد الستار ملک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔
عرصہ اٹھائیس سال سے اردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ ہیں۔ لسانیات اور تدریسِ زبان ان کی دلچسپی کے خاص میدان ہیں۔
متعدد مطبوعہ اور زیرِ طبع کتب ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ پچاس سے زائد مقالات تحقیقی اور ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ بیسیوں ایم فل اور پی ایچ ڈی مقالات کی نگرانی کی۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے بی ایس اردو کے پروگرام کے بنیاد گزار اور غیر ملکیوں کے لیے اردو زبان دانی کے کورس کے فوکل پرسن ہیں۔ بطورِ پروگرام رابطہ کار بی ایس کے کورسز کی تیاری کے علاوہ بیورو برائے یونیورسٹی توسیع خصوصی پروگرام علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی پرائمری اور ایلیمنٹری کے مربوط اردو نصاب کی تیاری میں بطورِ شریک مولف کام کیا۔ ان کے مستقبل کے پراجیکٹ میں غیر ملکیوں کے لیے مطبوعہ اور ڈیجیٹل مربوط تدریجی نصاب کی تیاری بھی شامل ہے۔

مصنف کی دیگر کتب:

اردو زبان کی تدریس: مسائل ومباحث

اردو لسانیات سے متعلق کتب اور تحقیقی کام کا توضیح اشاریہ

تحقیقی مقالات

اُردو لسانیات: تفہیم و تعبیر

اُردو بطور غیر ملکی زبان: نصابی کتب اور دیگر مواد کا تنقیدی جائزہ (زیرِ طبع)

اُردو الفاظ کی تشکیل: پس منظر اور امکانات (زیرِ طبع)